بسم اللہ الرحمن الرحیم
عقل و علم
نتائج فکر
مفکر اسلام فقیہ بارع علامہ محقق
سید حسین مرتضی
مدظلہ العالی
تحریر
آنسہ زینب امیر علی و بیگم افشین فاطمہ آغا
زہراء (س) آکاڈمی

کتابخانہ مرتضوی۔ کراچی، پاکستان

http://ml.com.pk

کتاب کا نام ــــ عقل و علم
نتائج فکر ــــ استاد الفقہاء و المحققین حجۃ الاسلام والمسلمین فقیہ بارع
علامہ محقق حاج سید حسین مرتضیٰ صدر الافاضل نقوی مدظلہ العالی

تحریر ــــ بیگم افشین فاطمہ آغا
آنسہ زینب امیر علی
کتابت ــــ محمد ارشد تارڑ

ناشر ــــ زہراء (س) اکادمی پاکستان
طبع ــــ اوّل 28 جولائی 2000ء ۲۵ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
تعداد ــــ ۳۰۰۰

ڈیجیٹل اشاعت : کتابخانہ مرتضوی۔ کراچی، پاکستان (http://ml.com.pk)

نوٹ : اس کتاب کی کتابت میں صفحہ ۶۲ سے متعلق ایک حصہ صفحہ ۶۹ میں چھپ گیا تھا۔ اس ڈیجیٹل اشاعت میں اس کی تصحیح کردی گئی ہے۔ صفحہ ۶۲ اور ۶۹، صفحہ ۶۲/۱ اور ۶۲/۲ میں موجود ہے۔

انتساب

اللہ کے رحمٰن و رحیم نام سے

میں اپنی اس فکری کاوش کو

اپنی پیاری امی،

حاجیہ بیگم سیدہ عابدہ خاتون رحمۃ اللہ علیھا

بنت

آیۃ اللہ علامہ سید زاہد حسین بارھوی رحمۃ اللہ علیہ

اور

اپنی خوشدامن صاحبہ

بیگم سیدہ کنیز زھراء۔ رحمۃ اللہ علیہا

بنت

مولانا سید محمد جعفر نقوی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام سے منسوب کرتا ہوں۔

اور

بارگاہ ربوبیت میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے خاص طور سے ان دونوں بزرگوں کے درجات کو بلند فرمائے۔

آمین بحق محمد و آلہ الطاھرین

سید حسین مرتضیٰ

سید حسین مرتضیٰ

۴ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ

فہرست مطالب

استاد کی رائے:

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ استاد شیخ

محمد ہادی معرفت مدظلہ العالی

کتاب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وسلام على محمد وآله الطاهرين . وبعد فإن سلسلة الدراسات الإسلامية
التي ألقاها بصورة محاضرات وبينه في أصول معارف المحقق العلامة السيد حسيني
مرتضى نجل المرحوم آية الله العلامة السيد مرتضى حسين صدر الأفاضل تغمده الله برحمته لتعد
من أثمن الدراسات الدينية التي تبث روح الفضيلة في أوساط الجيل الحاضر والمستقبل
أيضاً بعون الله تعالى . وقد رأيتها باحثة عن أهم المسائل الخلقية والاجتماعية
التي تمس واقع الحياة الحاضرة وتعمل في تطويرها وترسيمها على الشكل الذي
رسمه الإسلام منذ البدء ويريدها مع الأبد . فإن صاحب الفضيلة سيدنا
الأجل قد مارس الحقيقة ولمس حاجة الزمان في كل أبعادها في السلوك
والعرفان الديني الأصيل وعرضها عرضاً شاملاً ومنطبقاً بتمام واقع الحياة
في أوجز بيان وأبلغ كلام وفي أسلوب رصين ومتين يتقبله النسل الرشيد
فلله دره وعليه أجره ولا زال موفقاً مسدداً برعاية الله وتحت عنايته السامية .
والحمد لله رب العالمين . قم المقدسة - محمد هادي معرفة

٢٦ محرم الحرام ١٤٢١

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور محمد مصطفیٰ نیز ان کی پاک و پاکیزہ آل پر سلام کے بعد :

اس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ علوم اسلامی پر عالیجناب محقق علامہ سید حسین مرتضیٰ بن مرحوم آیۃ اللہ علامہ سیّد مرتضیٰ احسین صدر الافاضل کے بعض دروس کا مجموعہ ہے۔ ان دروس کو انہوں نے برسوں لیکچرز کی صورت میں پڑھایا ہے۔ اب یہ مجموعہ (ان کی عزیز اور ہونہار شاگردوں آنسہ زینب امیر علی و بیگم افشین فاطمہ آغا کی کوششوں کے نتیجہ میں) کتابی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے اسلامی علوم و معارف کے کلیات و اصول کو بہت واضح اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔

میری نظر میں یہ مجموعہ دینی دروس کا ایسا قیمتی اور اہم مجموعہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مدد کے ذریعہ عہدِ حاضر اور مستقبل بعید میں آنے والی نسلوں میں شریعت اور فضیلت کی روح بیدار کرتا رہے گا۔

میں نے ان دروس کا مطالعہ کیا ہے اور دیکھا ہے کہ ان میں علامہ موصوف نے تخلیقِ انسانی نیز انسانی معاشرہ کے حساس اور بنیادی مسائل پر انتہائی عمیق گفتگو کی ہے۔

ان دروس کا ایک اور اہم امتیاز یہ ہے کہ علامہ موصوف نے ان

مسائل کو بالکل اسی انداز میں پختہ کر کے اور متکامل بنا کر ایسی ہی شفاف اور درست شکل میں پیش کیا ہے جس انداز سے اسلام نے انہیں اپنے آغاز میں پیش کیا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اسی انداز میں پیش اور قبول کئے جاتے رہیں، گویا،

ہمارے عالی مرتبت اور جلیل القدر مفکر نے پہلے دینی زندگی کے اصل اور واقعی علمی و عرفانی پہلوؤں کے بارے میں حقیقت تک رسائی حاصل کر کے زمانہ کی ضرورتوں کا احساس کرتے ہوئے ان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ پھر اسے زندگی کی حقیقتوں سے تطبیق دے کر اپنی مختصر بیانی اور بلاغت کلامی کے ساتھ ایسے دل نشین انداز اور فنی طریقہ سے پیش کیا ہے۔ جسے پختہ عقل والے قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

جس اللہ نے انہیں یہ توفیق عطا کی ہے انشاء اللہ وہی انہیں اس کا اجر بھی عطا فرمائے گا۔

میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور توجہ کے سبب اسی کی بے پناہ عنایتوں کے سایہ میں ہمیشہ کامیاب و کامران رہیں۔

والحمد للہ رب العالمین

۲۶ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ — قم مقدسہ — محمد ھادی معرفت

ہم عصر محقق وفقیہ

حاج شیخ سامی الغریری

رقمطراز ہیں

بسم الله الرحمن الرحيم

ان بحث الإنسان الواعي في هذه الأيام عن العقل يعطينا أكثر من معنى ويشدنا من جديد إلى التراث، ويضعنا أمام واقع جديد، والعمل الشجاع في هذه الحقبة من الزمن، واعطاء الرأي بصراحة، ووضوح رؤيا في وقت خبت فيها أنوار الحق، وانطمست معالم الهدى، وغشي العالم ظلام الجهل الحالك، وتاهت العقول في مهامة الشرك والضلال، ومن هنا نرى دراسة العلامة الكبير، والمحقق الجدير، والفقيه البارع، السيد حسين مرتضى النقوي صدر الأفاضل، جاءت بتحليل مسار البرهنة، الذي يهدف إلى تحديد الدلائل التي يستشهد بها المتحدث للتدليل على صدق ما يقول لإقناع المتلقي، والتأثير عليه، لأن التطبيقات النظرية والعملية نادرة في هذا الزمن، ولأن الموضوعية تعني فهم أو تصوير الواقع الذي يدرس الباحث، بحيث يكون مطابقاً بقدر الإمكان، لما كان عليه هذا الواقع بالفعل كما ان الموضوعية تعني عدم الانحياز المسبق من الباحث، وان يبدأ بحثه بهدف اكتشاف الحقيقة والافصاح عنها.

ان العلامة السيد حسين مرتضى النقوي صدر الأفاضل، من أولياء الله تعالى، وممن ينطبق عليهم قول الإمام علي بن أبي طالب (ع) حيث قال هم الذين: «هجم بهم العلم على حقيقة البصيرة، وباشروا روح اليقين، واستلانوا ما استوعره المترفون، وآنسوا بما استوحش منه الجاهلون، آه، آه، شوقاً إلى رؤيتهم» نهج البلاغة، الحكمة / ١٤٧

الشيخ سامي الغريري
العاشر من صفر ١٤٢١ هـ

رحمٰن ورحیم اللہ کے نام نامی سے

آج کل جب کوئی مفکر عقل کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو، اس سے ہمارے لئے لامتناہی مفاہیم کے دروازے کھلتے ہیں، ہمیں نئے سرے سے اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کی اہمیّت کا اندازہ ہوتا ہے اور ہم نئی حقیقتوں کا سامنا کرتے ہیں۔

آج کے دور میں اس قسم کا کام شجاعانہ و دلیرانہ ہے۔

کیونکہ،

اس زمانہ میں کسی فکری معاملہ میں صراحت وصاف گوئی کے ساتھ دو ٹوک انداز میں اپنی رائے کا اظہار اور اس کی وضاحت' ایسے حالات میں ایک پختہ اور سچے خواب کی طرح ہے، جب حق کا نور آنکھوں سے اوجھل ہے، ہدایت کے منارے دھندلے نظر آرہے ہیں، دنیا جہالت کی گھٹاٹوپ اور ہلاک کر دینے والی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے نیز عقلِ انسانی شرک وگمراہی کی بھول بھلیوں میں راستہ ڈھونڈنے میں مشغول ہے۔

اس پس منظر میں علاّمہ کبیر، محقق عالی قدر اور فقیہ بارع جناب سیّد حسُین مرتضیٰ نقوی صدر الافاضل ہی جیسے شجاع اور باہمت انسان اس قسم کا مقالہ تحریر کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

علامہ موصوف کا یہ مقالہ دلائل و براھین کے ایسے تجزیہ وتحلیل کا حامل ہے

جو پڑھنے والے کے ذہن میں خود بخود ایسی دلیلیں ابھارتا ہے جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ وہ خود ان کے موقف کو اچھی طرح سمجھ کر مان لیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر دوسروں کو سمجھانے اور قائل کرنے کی قدرت بھی پیدا کر لیتا ہے نیز، نہ صرف یہ کہ وہ اس کو پڑھ کر اپنے فکر و عمل میں اس کا اثر و انعکاس محسوس اور قبول کرتا ہے بلکہ دوسروں کے افکار و اعمال و شخصیات پر بھی اس کے اثر اور انعکاس کا سبب بننے لگتا ہے۔

کیونکہ،

اس کتاب میں محقق عالی قدر نے فکر و عمل کے امتزاج یعنی فکری و عملی تطبیق کا جو نفیس اور اچھوتا اسلوب اختیار کیا ہے وہ آج کے دور میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتا۔

نیز یہ کہ،

فکری کام کے دو پہلو ہیں:

ایک یہ کہ، مفکر و محقق جس موضوع یا نکتہ پر تحقیق و جستجو یا تفکر و تدبر کرنا چاہتا ہے اس کو پوری گہرائی کے ساتھ سمجھے اور اپنے ذہن میں اس طرح اس کی تصویر کشی کرے جو واقعی اور حقیقی ہو، نیز نہ صرف یہ کہ خیالی اور تصوراتی نہ ہو بلکہ حتی الامکان اس کی عملی صورت سے مطابقت بھی رکھتی ہو۔

دوسرے یہ کہ، مفکر و محقق اس کے بارے میں پہلے سے موجود تصورات و خیالات میں ملوث اور ان سے متاثر نہ ہو بلکہ اپنی تحقیق و جستجو اور تفکر و تدبر کو آزادانہ طور پر موجود تصورات سے الگ ہو کر حقیقت تک پہنچنے اور سمجھانے کے لئے مخلص بھی ہو اور مضبوط ارادہ کا حامل بھی۔

چنانچہ،

علامہ سید حسین مرتضیٰ نقوی صدر الافاضل نے یہ دونوں کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ان "اولیاء اللہ" میں سے ہیں

جن کے لئے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسے عظیم الشان انسان اور مولائے متقیان نے اپنی تمنا کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے:

یہ وہ لوگ ہیں کہ علم بصیرت کی گہرائیوں اور اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو گیا ہے۔

نیز،
یقین کی روح ان کے جسم و جان کا جزو بن گئی ہے
اس لئے،
جن کاموں کو اہل دنیا سخت سمجھتے ہیں وہ ان کیلئے آسان ہیں۔
اور،
جن باتوں اور کاموں سے جاہل ڈرتے اور فرار کرتے ہیں یہ ان سے مانوس اور ان کے دلدادہ ہیں۔
کاش !
میں، ان کی زیارت سے مشرف ہوتا...... !!

(نہج البلاغہ حکمت نمبر ۱۴۷)

الشیخ سامی الغریری
۱۵، صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
حوزہ علمیہ قم

تشکر و امتنان

اللہ جل جلالہ کے نام نامی سے جو رحمٰن ورحیم بلکہ ارحم الراحمین ہے،
اس کے سایہ رحمت، محبوب خاص حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پاک وپاکیزہ ذریت پر دل کی گہرائی سے نکلے ہوئے درود وسلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بے پناہ نعمتوں کے شکرانہ کی توفیق طلب کرتے ہوئے چند گزارشات عرض خدمت ہیں۔

عقل وعلم یا علم وعقل، اسلام کی دو خصوصی اصطلاحیں ہیں۔ اسلام نے انسان کو عقل استعمال کرنے اور علم کے بلند ترین مراتب تک پہنچنے کی دعوت دی ہے۔ تمام اسلامی مآخذ خواہ وہ قرآنِ حکیم کی صورت میں ہوں یا حدیث وسنت کی شکل میں، سب ہی انسان کو عقل استعمال کرنے اور علم کے اعلیٰ مراتب تک رسائی حاصل کرنے کی تاکید کرتے ہیں اور اسی کو انسانیت کا شرف وعزت بتاتے ہیں۔

لیکن،

اتفاق کی بات ہے کہ اس بات پر بہت کم گفتگو ہوئی ہے کہ:

اسلامی اصطلاح میں عقل اور علم کسے کہتے ہیں؟

اور،

اگر کہیں ہوئی بھی ہے تو فنی نقطۂ نظر کے بجائے عامیانہ طریقہ سے ہوئی ہے۔

دنیا کے ہر خطہ اور طبقہ کے لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب بھی کوئی لفظ بولا یا استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے پس منظر، یا اگر وہ کسی خاص علمی یا فنی شعبہ سے متعلق ہو تو اس کے مطابق اس سے متعلقہ خاص معانی و مفاہیم ہی مراد لئے یا سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے جب بھی کسی عبارت کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا پس منظر کیا تھا یا یہ علم کی کس شاخ یا شعبہ میں استعمال ہوا ہے؟

سادہ سی مثال ہی کو لے لیجئے کہ ہم ایک فقرہ دو موقعوں پر بولتے ہیں تو دونوں جگہوں پر ایک ہی فقرہ سے دو الگ معانی مراد ہوتے ہیں۔

۱۔ میں پرچہ دے آیا۔

ا۔ جب کوئی بچہ امتحان کے دنوں میں اسکول سے گھر آ کر دوستوں یا والدین سے یہ جملہ کہتا ہے تو اس کا یقینی مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ امتحان کا پرچہ دے کر آیا ہے۔

ب۔ جب کوئی چپراسی یا قاصد اپنے افسر یا مالک سے یہی جملہ کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو غیر رسمی تحریر اس کو پہنچانے کی ذمہ داری دی گئی تھی وہ اس نے ادا کر دی ہے۔

۲۔ پانی لادو۔

ا۔ جب کوئی خاتون باورچی خانہ سے یہ آواز دے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سالن یا چائے کے لیے پانی درکار ہے۔

ب۔ جب یہی بات کوئی شخص کھانے کی میز یا ملاقات کے کمرہ میں بیٹھ کر کہے تو اس سے مراد پینے کا پانی ہوگا۔

ج۔ یہی بات جب کوئی شخص کسی ننھے بچے کو سخت سردی میں دھلاتے یا نہلاتے ہوئے کہے تو اس سے نیم گرم پانی مراد لیا جائے گا۔

۳۔ اس چشمہ کو دیکھو۔

ا۔ جب میز پر بیٹھا ہوا شخص عینک ہاتھ میں لیے ہوئے یا چہرہ پر سجائے ہوئے یہ جملہ کہے تو اس سے عینک مراد ہوگی۔

ب۔ لیکن جب یہی جملہ کسی سرسبز و شاداب مقام پر تفریح کے دوران کہا جائے تو اس سے پانی کا ابلتا ہوا چشمہ مراد ہوگا۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ہی لفظ کو مختلف موقعوں پر اور زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف معانی میں استعمال کرنا ایک عام انسانی دستور ہے۔

اسی طرح،

ان ہی مثالوں پر غور سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی لفظ یا جملہ کے معانی اس کے فنی پس منظر اور علمی شعبہ کو مدنظر رکھے بغیر نہیں سمجھے جا سکتے۔ مثلاً جغرافیہ کی زبان میں چشمہ زمین سے ابلتے ہوئے پانی کو اور طبی زبان میں چشمہ "عینک" کو یا تعلیمی زبان میں پرچہ، امتحانی پرچہ کو اور دفتری یا گھریلو زبان میں پرچہ کاغذ کے ٹکڑے پر لکھے ہوئے غیر رسمی تحریری پیغام کو کہا جاتا ہے۔

اس اصول کے تحت عقل و علم کی اصطلاحیں بھی مختلف علوم میں مختلف معانی میں استعمال ہوتی ہیں۔

الف ۔ خالص دنیادار حلقوں میں عقل کا کلمہ عیاری اور دھوکہ بازی کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

ج ۔ عام انسانی اصطلاح میں عقل، ذاتی تحفظات کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت اور ادراک کا نام ہے۔

د ۔ قومیت کے فلسفہ میں عقل، قوم کے مستقبل کی پیشین گوئی کے ساتھ قومی مفادات سے متعلق دوررس فہم و بصیرت کو کہا جاتا ہے۔

ہ ۔ اداری علوم میں عقل، افسر اعلیٰ کی چاپلوسی کے ساتھ اس کی

بے چون وچرا فرمانبرداری کو کہا جاتا ہے۔

وغیرہ وغیرہ

یہی حال علم کی اصطلاح کا ہے۔

پیشِ نظر مقالہ میں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ غور کریں کہ جب عقل و علم کی اصطلاح الٰہی معارف، قرآنِ حکیم، یا اسلام میں استعمال کی جاتی ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟ عقل کیا کیا کام کس کس طرح انجام دیتی ہے؟ علم کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

''عقل و علم'' نامی یہ کاوش جو اس وقت آپ، کے ہاتھوں میں ہے' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ نہ کسی کتاب کا ترجمہ و تلخیص ہے، نہ ہی جمع و ترتیب اور نہ ہی یہ کوئی تحقیقی کاوش ہے۔

بلکہ،

یہ خالصتاً ایک فکری کاوش اور میرے کم از کم چالیس ۴۰ سالہ مطالعات و تحقیقات و تفکر و تدبر کا ایک خام نتیجہ اور ابتدائی خاکہ ہے۔ یہ ان چند مختلف موضوعات و عناوین میں سے ایک ہے جن پر میں تقریباً چالیس ۴۰ سال سے مسلسل مطالعہ، تحقیق اور تفکر و تدبر میں مصروف ہوں۔

میں نے اپنے فکری نتائج کو مختلف وقفوں سے نہ صرف اپنے اکابر اساتذہ کے سامنے پیش کر کے ان کی اصلاح و تکامل کی ذمہ داری ادا کی ہے، بلکہ ان چالیس ۴۰ برسوں میں، میں نے اپنے ان فکری نتائج کو مختلف سطح، مختلف ثقافتوں، مختلف ملکوں اور مختلف مذاہب و ملل کے مفکروں اور اسکالرز کے سامنے بھی پیش کیا ہے اور ان کے نوجوانوں کو درسی طور پر پڑھا کر ان جوانوں کی فکری جولانیوں سے بھی استفادہ کرتے ہوئے ان موضوعات پر اپنے فکری نتائج کی اصلاح اور تکامل کی کوشش بھی کی ہے۔

شاید، میں ابھی ان نتائج کو قلم اور کاغذ کے حوالہ کر کے چھپی ہوئی شکل

میں آپ لوگوں کے سامنے پیش نہ کرتا لیکن میرے بہت سے شاگردوں نے میرے ساتھ اس طرح کام کیا کہ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی کاوشوں کی قدردانی کے طور پر یہ فکری نتائج آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری محسوس ہونے لگے۔

یوں تو جن اساتذہ اور شاگردوں نے ان نتائج کو مختلف مراحل سے گذار کر یہاں تک پہنچانے میں میری مدد کی ہے ان کی تعداد سینکڑوں پر مشتمل ہے اور ان سب کے نام بھی مجھے یاد نہیں ہیں۔

لیکن،

ان سب کے اظہار تشکر کے طور پر چند کا ذکر شاید سب کے لیے تشویق اور تسکین کا باعث ہو۔

میں نے ان موضوعات پر ۱۹۶۰ء سے کام شروع کیا اور ۱۹۶۵ء سے مختلف حلقوں میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں، میں نے قرآن وحدیث کے براہ راست مطالعہ اور ان کے مشکل مقامات پر بار بار غور وفکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مسلسل مدد اور راہنمائی کی استدعا، التجاء اور تمنا کو اپنا اصول اور ضابطہ بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے محمدؐ وآلِ محمد علیہم السّلام کے صدقہ میں میری مدد کی اور مجھے ایسے استاد اور ایسے شاگرد عطا کرنا شروع کر دیئے جو میرے اس فکری ارتقائ اور تکامل میں میرے مددگار اور معاون ثابت ہوئے۔

سب سے پہلے اس سلسلہ میں میرے والد ماجد اور نانا مرحوم یعنی مرحوم ومغفور آیۃ اللہ علامہ سید زاہد حسین بارہوی جو آقای بارہوی کے نام سے مشہور تھے، میرے نانا ہیں، وہ حدیث وتفسیر میں بحر ذخار تھے۔ اسی کے ساتھ میرے والد ماجد مرحوم ومغفور حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ محقق وحید حاج سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل جو تفسیر وحدیث وفقہ کے ساتھ فلسفہ، کلام منطق، تاریخ اور ادبیات میں مہارت رکھتے تھے نے میری تشویق راہنمائی اور مدد فرمائی ۱۹۷۲ء سے استاد معظم آیۃ اللہ علامہ حاج سید ابن حسن نجفی مدظلہ العالی نے بھی

اس میدان میں میری بھرپور راہنمائی شروع کر دی۔

پھر ۱۹۷۵ء میں، جب میں حوزھای علمیہ مشھد، قم، اصفہان و تہران آیا تو یہاں پر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید ھادی میلانی مرحوم، حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ استاد محمد تقی جعفری مرحوم، حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی فانی مرحوم، حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ حسن سعید چہل ستونی مرحوم، حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید شہاب الدین نجفی مرعشی مرحوم، حضرت آیۃ العظمیٰ شیخ محمد حسین کلباسی مرحوم، اور بعض دوسرے اکابر نے ان نتائج کی پختگی اور تکامل میں میری راہنمائی، تشویق اور مدد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے درجات کو بلند فرمائے۔ اور میرے تمام اعمال و افکار خیر کا ثواب ان مرحومین اور ان تمام افراد کو عطا فرمائے جو کسی نہ کسی زاویہ سے اس میں شریک و سہیم رہے ہیں۔ آمین

اس کے بعد،

۱۹۷۹ء میں مجھے تین بہت ذہین سمجھدار اور مودب شاگرد ملے جو اس زمانہ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور اب ماشاء اللہ یہ تینوں ڈاکٹر ہیں۔ ان شاگردوں نے میرے بہت سے دوسرے شاگردوں کے ساتھ مل کر اس فکری سفر میں میری بہت مفید اور یادگار مدد کی ان تینوں کے نام ڈاکٹر کرنل سید بادشاہ حسین زیدی، ڈاکٹر حسین الیف کنانی اور ڈاکٹر سید ضیاء عباس رضوی ہیں۔

یہ فکری سفر اپنی منزلیں طے کرتا رہا اور تفکر و تدبر کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے فرائض انجام پاتے رہے۔ اس سفر میں بعض مرحومین اور ان تینوں شاگردوں کے علاوہ بہت سے اور بزرگوں اور خوردوں کا اضافہ ہوتا گیا جن میں اساتذہ میں سے حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ حسین راستی کاشانی مدظلہ، حضرت آیۃ اللہ شیخ حسین محفوظی دام ظلہ، حضرت آیۃ اللہ استاد شیخ محمد ھادی معرفت دام ظلہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح شاگردوں میں مولانا سید آفتاب حیدر رضوی، مولانا سید مرتضیٰ حسین حسینی، مولانا سید قرۃ العین عابدی، مولانا عابد رضا عرفانی مولانا سید افتخار عابد نقوی، مولانا شمشاد حیدر مرتضوی، مولانا شیخ محمد نجفی، مولانا شیخ عقیل عباس صادقی، مولانا شیخ محمد مجیر میثمی مولانا شیخ نور عالم محمدی، مولانا سید ظفر مہدی نقوی، مولانا سید غلام عباس رضوی، مولانا سید علی سلمان نقوی اور علامہ شیخ شبیر حسن میثمی دامت توفیقاتہم، نیز خواتین شاگردوں میں، آنسہ فضہ ناز، آنسہ بتول زہرا، آنسہ کرن جعفری، آنسہ سیدہ نشاط زیدی، آنسہ سیدہ صباحیدر زیدی، آنسہ نگہت ناصر، آنسہ سیدہ صباحت زہرا، آنسہ سیدہ افتخار فاطمہ، بیگم ارم ناز، بیگم فرح ناز، بیگم شہلا انجم، بیگم نایاب زہرا، بیگم بتول صابر، بیگم ماریہ شریف، بیگم مرضیہ حبیب، بیگم غزالہ کرم علی، ثقۃ الاسلام سیدہ ثمینہ رضوی، ثقۃ الاسلام شگفتہ ناز ثقۃ الاسلام وزیر فاطمہ سبزواری، ثقۃ الاسلام سیدہ شاذیہ زیدی، ثقۃ الاسلام سیدہ بتول زہرا جعفری اور میری شریکہ حیات ثقۃ الاسلام طلعت سیدہ جعفری دامت توفیقاتھن نے ان مفاہیم کو سمجھنے اور ان پر نقد و نظر کر کے انہیں مزید پختہ بنانے میں بڑی ہمت و جرات کا ثبوت دیا۔

اس کے باوجود شاید یہ نتائج ابھی آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتے اگر ان حضرات و خواتین میں سے دو گروہوں نے اس کو اس تحریری اور تصویری شکل دینے میں میری مدد نہ کی ہوتی۔

ان دو گروہوں میں سے ایک گروہ آنسہ زینب امیر علی اور بیگم افشین فاطمہ آغا پر مشتمل ہے۔ میری ان دونوں بیٹیوں نے مختلف ادوار میں میرے لیکچرز کو بڑے غور سے سنا اور سمجھا۔ اس کے بعد ان دونوں نے تمام دروس کو چند صفحات میں خلاصہ کے طور پر لکھ کر دکھایا۔ ان کی اس تحریر کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں بیٹیوں نے نہ صرف یہ کہ ان مفاہیم کو اچھی طرح سمجھا ہے بلکہ اس طرح سمجھ لیا ہے کہ یہ آسان فہم زبان میں ان مفاہیم کو دوسروں تک منتقل کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔

اس لیے جب میری ان دونوں بیٹیوں نے ان دروس کو کتاب کی شکل میں مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے ان تمام نوٹس کو ان کے حوالے کر دیا جو مختلف ادوار میں خود میں نے یا میرے مختلف شاگردوں خصوصاً بیگم طلعت حیدر سلمہا نے تیار کئے تھے۔

ان دونوں بیٹیوں نے ان تمام نوٹس کو پڑھنے، سمجھنے اور تدوین و مکرر دانی میں بڑی محنت اور خوش اسلوبی سے کام کیا، اور جب اسے آخری شکل میں میرے سامنے پیش کیا تو میں نے اس بات کو اپنی ذمہ داری سمجھا کہ اب اسے قارئین اور مفکرین کے مطالعہ اور نقد و نظر کے لیے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

لیکن،

یہ کتاب ناقص رہ جاتی اگر ایک دوسرے گروہ نے اس میں موجود شکلوں سے متعلق مفاہیم کو سمجھنے اور پھر انہیں شکلوں میں نمایاں کرنے میں میری مدد نہ کی ہوتی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور بنیادی کام ۱۹۷۹ء میں ڈاکٹر کرنل سیّد بادشاہ حسین زیدی سلمہٗ نے کیا، اسکے بعد مختلف شاگردوں نے مختلف ادوار میں ان شکلوں کو مکمل کرنے میں میری مدد کی یہاں تک کہ ۱۹۹۷-۱۹۹۸ء میں عزیز القدر جناب سید علی زیدی سلمہٗ نے ان شکلوں کو تقریباً آخری مراحل تک پہنچا دیا، اس کے بعد جب جناب قاضی سید سرفراز نقی رضوی نے ان شکلوں کو دیکھا اور ان کے مفاہیم کو سمجھا تو انہوں نے کتاب کی کتابت مکمل ہونے کے آخری مرحلہ میں یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ کمپیوٹر پر ان شکلوں کو مزید تفصیل اور دقت کے ساتھ مرتب کریں۔ چنانچہ انہوں نے پورے ایک ہفتہ کی رت جگا کے بعد ان شکلوں کو ایک اور مرحلہ تک پہنچایا، اور اس کے بعد برادر ارجمند مولانا شیخ مسلم فدا حسین سلمہٗ نے ان شکلوں کو آخری اصلاحات کے ساتھ موجودہ صورت حال میں آپ کے سامنے پیش کر دیا۔

اسی طرح اس کتاب پر نظر ثانی کے دوران مولانا سید غلام عباس رضوی صاحب اور مولانا سید ظفر مہدی نقوی دامت توفیقاتہما نے بعض نکات کو پختہ کرنے میں میری بھرپور مدد کی۔

اسی طرح اس مقالہ کو کتابت، تزئین اور پیشکش کے فنی مراحل سے گذارنے اور اس فنی انداز میں آپ کے ہاتھوں میں پیش کرنے میں برادران ارجمند جناب سید آل حسنین نقوی صاحب، جناب امیر علی صاحب جیوانی اور جناب محمد ارشد تارڑ کاتب نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار فرمایا ہے۔

یوں، یہ مقالہ فقط ایک شخص کی نہیں بلکہ بہت سے اشخاص کی ہمتوں اور فکری جولانیوں، مطالعات وتحقیقات اور تفکر وتدبر کا نتیجہ ہے، اور ہم اس نعمت پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہم سب کو مل جل کر اس سفر کو انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ آمین. بحق محمد وآلہ الطاہرین۔

آخر میں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس مقالہ میں آپ کو جو کچھ ملے گا وہ قرآن وحدیث کے براہ راست اور مسلسل تیس چالیس سالہ مطالعات پر غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ یہ تحقیقی نہیں بلکہ خالص فکری مقالہ ہے۔ ایسا فکری مقالہ جس کی اساس قرآن وحدیث ہے۔ البتہ ان نتائج کے حصول کے دوران دوسرے علماء، محققین، مفکرین اور فلاسفہ کے اقوال وافکار کو بھی اچھی طرح پرکھا اور تولا گیا ہے۔

چونکہ ہم نے اپنے فکری تجزیہ وتحلیل اور نتائج کی بنیاد ان آیتوں اور حدیثوں پر ہی رکھی ہے جو عام طور سے ہر مسلمان کی دسترس میں ہیں اور ہمارے معاشرہ میں روزمرہ ان پر کسی نہ کسی زاویہ سے گفتگو ہوتی ہی رہتی ہے، اس لئے ہم نے بہت زیادہ حوالے دینے اور اسناد پیش کرنے سے پرہیز کیا ہے۔

اسی طرح چونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ان فکری نتائج کو عام آدمی بھی اسی طرح

سمجھ کران پر نقد و نظر کی قدرت پیدا کر سکے، جس طرح ایک فاضل اور محقق و مفکر کا حق ہے۔ اس لئے ہم نے پیچیدہ اور خالص منطقی استدلال کے بجائے خالص قرآنی روش یا انداز کی پیروی کرتے ہوئے انتہائی سادہ اور فطری طرز استدلال سے کام لیا ہے۔

اس مقالہ میں ہماری ایک اہم کوشش یہ ہے کہ عام سطح کے انسان خاص طور سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ اپنی پوشیدہ عقلی قوت اور فکری طاقتوں کا ادراک کر کے ان کو استعمال کی قدرت پیدا کریں اور کائنات کے تکامل میں مددگار و معاون بنیں۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اس الٰہی منصب کے ادراک اور اس منصب کے فرائض کی ادائیگی کی توفیق مرحمت فرمائے جسے اس نے خود خلافت الٰہیہ کا نام عطا کیا ہے۔

آمین بحق محمدؐ و آلہ الطاہرین

سید حسین مرتضیٰ

سید حسین مرتضیٰ

موسس و سرپرست

زہراء (س) اکادمی پاکستان

۴، محرم الحرام ۱۴۲۱ ھ ق

۹، اپریل ۲۰۰۰، عیسوی

۲۱، فرودرین ۱۳۷۹ ھ ش

حوزہ علمیہ قم، ایران

عقل اور موجوداتِ عالم

خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کو خلق کرنے کے بعد فرشتوں سے کہا:

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِیْنَ

"جب میں اس کو بنانے اور خلق کرنے کے بعد اس میں، اپنی روح پھونک دوں اس کے بعد تم اس کے تابعدار رہو۔"

(سورۂ حجر ۱۵، آیت ۲۹)

خدا نے پہلے حضرت آدمؑ کو خلق کیا اور پھر ان میں روح پھونکی۔ یہاں خلق کرنے کے بعد روح پھونکنے سے خدا کی مراد کیا ہے؟

"خلق ہونے سے مراد کسی بھی شئی کا لاشئی سے وجود میں آنا ہے۔"

جب بھی کوئی شئی نہ ہونے سے ہونے میں آتی ہے تو وہ حیات کی صفت سے متصف اور مزین ہو جاتی ہے۔ اس کو زندگی مل جاتی ہے۔

کچھ چیزوں کی زندگی کا ادراک و احساس ہمارے حواس کر لیتے ہیں۔ تو ہم کہتے ہیں کہ یہ زندہ ہیں۔ کچھ چیزوں کی زندگی کا ادرک ہمارے حواس نہیں کر پاتے تو ہم انہیں مردہ قرار دے دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب ایک انسان مر جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ مردہ ہے۔ جبکہ دراصل وہ لاش زندہ ہوتی ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد وہ اپنی حالت کو

تبدیل کر لیتی ہے اور خاک بن جاتی ہے۔ کسی شئ کا ایک حالت سے دوسری حالت میں جانا اس کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ چونکہ ہمارے حواس اس کی زندگی کے درک سے قاصر ہوتے ہیں لہذا ہم اسے مردہ کہہ دیتے ہیں۔

لیکن،

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم علیہ السّلام انتقال فرماتے ہیں۔ تو آنحضرت غسل وکفن کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو قبر میں لٹاکر، آپ کو مخاطب فرماتے ہیں اور عقائد اسلام تعلیم فرماتے اور کلمہ کی تلقین فرماتے ہیں۔

اس لئے مسلمانوں میں مردوں کو دفن سے پہلے اور دفن کے بعد تلقین پڑھانے کا رواج ہے۔

اسی طرح،

حضرت علی علیہ السلام کسی جنگ سے واپس آرہے تھے راستہ میں ایک قبرستان سے گذر ہوا۔ آپ وہاں رکے۔ اصحاب کو مخاطب کیا اور فرمایا:

اگر سن سکتے ہو تو سنو!

یہ مردے اپنی دنیا کے بارے میں خبریں دے رہے ہیں۔

آج سائنس نے بھی اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں موجود ہر شئ ایٹم سے مل کر بنی ہے اور ہر ایٹم میں موجود الیکٹران مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔ ان کا حرکت کرنا ان کے زندہ ہونے کا ثبوت ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس ایٹم کے ذرہ میں بھی عقل موجود ہے۔ اسی لئے وہ اپنے راستہ سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کرتا۔

جب ہم ایک کرسی کو دیکھتے ہیں تو چونکہ ہم اس کی عقل اور زندگی کے ادراک سے قاصر ہیں لہذا ہم اسے بے عقل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر تمام اشیاء کے عاقل ہونے اور تسبیح خدا میں مشغول رہنے کی خبر

دی ہے۔

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اس میں اپنی روح پھونکوں تو اس سے مراد یہ تھی کہ جب میں اس کو ایک خاص مرتبہ کی عقل عطا کر دوں۔ کیونکہ اب تک جتنے مخلوقات کو خلق کیا تھا ان میں سے کسی کو اس مرتبہ کی عقل عطا نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے خدا نے فرشتوں سے کہا کہ جب میں اسے اتنی عظیم الشان نعمت عطا کر دوں تو تم اس کو سجدہ کرنا یعنی ہمیشہ اور بہر حال میں اس کے تابعدار بن کر رہنا۔

اللہ نے انسان کو جس مرتبہ کی عقل کی نعمت سے نوازا وہ اس عقل سے کہیں زیادہ طاقت ور اور کثیر الجہات MULTI HORIZONTAL AND POWER FULL تھی جو اس نے پتھروں، نباتات، جمادات وغیرہ کو عطا کی۔

خداوند عالم کی کسی بھی ایجاد کو بے عقل تصور کرنا ناسمجھی ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق عقل ہے، عقل سے برتر ہے، علم سے برتر ہے، حیاتِ مطلق سے برتر ہے۔ اس کے لئے محال ہے کہ وہ کسی بھی ایسی شئی کو خلق کرے جو کہ حیات اور علم سے عاری ہو۔ یہ تصوّر ہی باطل ہے کہ کوئی بھی مخلوقِ کائنات جاہلِ مطلق پیدا ہوئی ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مرتبہ کی عقل انسان کو عطا کی ہے وہ کیا ہے؟ اس کی قوت کی حدیں کیا ہیں؟ اس کو کس قسم کی قدرت حاصل ہے؟ یا مختصر الفاظ میں یہ کہ اس کی تعریف کیا ہے اور اس کو کیسے پہچانا جائے؟

عقل انسانی

قرآن حکیم میں خداوند متعال نے عقلِ انسانی کا تعارف یوں کرایا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اسے تمہارا فرمانبردار کر دیا ہے۔ سوچنے والوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں۔ (سورہ الجاثیہ ۴۵ آیت ۱۳)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا نے تمہارے لئے اسے مسخر کر دیا ہے۔ اور تم پر

اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں ۔ پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر جانے بوجھے لاعلمی، جہالت گمراہی اور بغیر کسی دلیل و برھان کے جھگڑا کرتے ہیں۔
(سورہ لقمن ۳۱، آیت ۲۰)

تعریف:

گویا قرآنِ حکیم کی زبان میں:
عقل ـــــ "قوت تسخیریہ"
یعنی کائنات کو مسخر کرنے والی قوت یا ـــــ قوتِ حاکمہ
یعنی کائنات پر حکومت و حکمرانی کرنے والی قوت ہے۔
کیونکہ،
اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اسی قوتِ عقلی کے سبب اپنی اس مخلوق یعنی بنی آدم کے تابع فرمان کر دیا ہے۔

عقل کی پہچان:

جس طرح ہر چیز کی نقل ہوتی ہے۔ اسی طرح عقل کی بھی نقل ہوتی ہے۔
لہٰذا،
ضروری ہے کہ اس کی صحیح طریقہ سے شناخت کی جائے۔ یعنی اسے اچھی طرح پہچانا جائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے الکافی جلد اول ص۵۸ پر کتاب العقل و الجہل میں ثقۃ الاسلام کلینیؒ کی روایت کے مطابق عقل کی شناخت یا پہچان یوں کروائی ہے:
جب سوال کرنے والے نے پوچھا تو امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:
"عقل ـــــ قوت تسخیریہ ہے ـــــ اس کی پہچان یہ ہے کہ:

۱۔ وہ عبادت واطاعتِ الٰہی میں مصروف رہے۔
حکمِ الٰہی کے سامنے ہمیشہ بلا چون وچرا سر تسلیم خم رکھے۔
نیز،
۲۔ اس کی تگ و دو اور کوشش جنت تک رسائی اور جنت کے حاصل کرنے کے لیے ہو۔
جس میں یہ دونوں صفتیں ہوں وہی عقل ہے۔
سائل نے پھر سوال کیا:
مولا ! جو ظالم وجابر حکمرانوں کے پاس ہے وہ کیا ہے؟
فرمایا:
یہ عقل نہیں بلکہ عقل کی نقل ہے۔
یہ عقل جیسی لگتی ہے مگر ہے نہیں۔
ظالم وجابر حکمرانوں نیز دھوکہ بازوں کے پاس جو عقل نما چیز ہے وہ شیطنت ہے۔ یہ دیکھنے میں تو خالص عقل محسوس ہوتی ہے، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔
اور یہ تو عام محاورہ اور عقل کا قانون ہے کہ:
ہر چمکتی چیز ہیرا یا سونا نہیں ہوتی ہے۔

الکافی جلد اوّل صفحہ ۷۰ پر کتاب العقل والجہل میں امام محمد باقرؑ سے روایت ہے، کہ خدا نے سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا پھر خدا نے عقل کو قوت تفکر استعمال کرنے اور سوچنے کا حکم دے کر فرمایا۔ "آگے آؤ۔" وہ آگے آئی۔ عقل بغیر چوں چرا کئے آگے آئی۔ پھر کہا۔ "پیچھے ہٹ"، تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔
جب خدا نے عقل سے کہا کہ آگے آؤ تو اس سے مراد یہ ہے کہ خدا نے

عقل کو ایک مقامِ بلند پر بٹھا دیا۔ اور پھر جیسے ہی کہا کہ پیچھے ہٹو تو اس سے مراد ہے کہ دوسرے حکم کی اطاعت کرو یعنی اپنے مقام بلند کو چھوڑ کر ایک پست مقام پہ آجاؤ۔

سوال یہ ہے کہ عقل نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے بھی فرشتوں کی طرح اللہ سے بحث کیوں نہ کی؟ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی بڑا عہدہ ملے تو بے چون وچرا لے لینا چاہیئے۔ لیکن جب اس عہدہ سے ہٹایا جائے یا اس کے بعد کسی پست عہدہ پر بٹھایا جائے تو دلیل طلب کرنا ضروری ہے۔

حالانکہ معقول بات تو یہ ہے کہ اگر عہدہ دینے والا اس شخص سے بلند مرتبہ ہے تو نہ عہدہ لیتے وقت، نہ عہدہ سے ہٹائے جانے کے وقت اور نہ ہی بلند کی جگہ پست عہدہ پر تعین کے وقت سوال جواب معقول ہے۔ کیونکہ عہدہ کی بلندی و پستی کا تعلق، عہدہ اور اس کے کام سے نہیں بلکہ عہدہ دینے والے کی حیثیت اور مرتبہ سے تعلق رکھتی ہے۔ عہدہ عطا کرنے والا اگر بلند ہو تو وہ جو بھی عہدہ دے وہ بلند ہی ہوتا ہے، خواہ دوسروں کی نظر میں وہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ کسی کی طرف سے دیئے جانے والے عہدہ کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے آپ نے اسے اپنے سے بہتر اور بڑا مان لیا ہے۔ اب آپ کے بارے میں اس کا ہر فیصلہ اسی پس منظر میں دیکھا جائے گا۔ یہ کوئی معقول بات نہیں ہوتی کہ جب کوئی شخص ایسا فیصلہ کرے جو سرسری طور پر آپ کو اپنے لیے بھلا معلوم ہو تب تو آپ اسے بڑا مان لیں اور جب وہ کوئی ایسا فیصلہ کرے جو بظاہر آپ کو پسند نہ ہو تو آپ اس کی بزرگی کو پائمال کر ڈالیں۔

عقل کی اس بلا چون وچرا اطاعت کا مطلب یہی تھا۔

عاقل شخص کسی بھی ایسے شخص سے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہو سوال نہیں کرتا ہے۔

عقل کی خوبی یہ ہے کہ وہ خدا کے سامنے جھکتی ہے اور اطاعت کرتی

ہے اور وہ جنّت کے لئے تگ و دو کرتی ہے۔ اس کو دنیا کی خواہش نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی ہے۔ اور اللہ کے حکم کی اطاعت کرتی ہے۔

الکافی، جلد اوّل صفحہ ۵۸ پر کتاب العقل والجہل میں حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کو حضرت آدمؑ کے پاس تین چیزیں دیکر بھیجا:

۱۔ عقل
۲۔ دین
اور ۳۔ حیا

حضرتِ جبرئیل نے حضرت آدمؑ سے کہا:

"اے آدم! اللہ نے یہ تین چیزیں تمہارے لئے تحفہ کے طور پر بھیجی ہیں اور کہا ہے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک چیز چُن لو۔"

تو حضرت آدمؑ نے عقل کو چن لیا۔ حضرتِ جبرئیل جب حیا اور دین کو واپس لے جانے لگے تو دین اور حیا نے کہا:

"اے جبرئیل! ہمارے لئے اللہ کا حکم ہے کہ جہاں بھی عقل رہے ہم عقل کے ساتھ ہی رہیں گے۔"

پھر حضرت جبرئیل نے اللہ سے استفسار کیا تو خدا نے فرمایا:

"ٹھیک ہے ان کو عقل کے ساتھ چھوڑ دو۔"

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حیا اور دین عقل کے ساتھ ہیں۔ اگر عقل نہیں ہے تو پھر انسان کا واسطہ نہ حیا سے رہتا ہے اور نہ دین سے رہتا ہے۔

جاہل دیندار نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ عاقل جو علم رکھتا ہے۔ وہ دیندار ہے۔ حیا سے مراد ہے کہ جو کام جس مقام کا ہو۔ اس کام کو اس مقام پر انجام دے۔

عقل کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ علم کے ساتھ رہتی ہے۔ عقل کے لئے علم کی ضرورت ایسی ہی ہے۔ جیسے مچھلی کے لئے پانی کی۔ جس طرح مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی ہے اسی طرح عقل علم کے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔

حیا اور دین کو عقل کے ساتھ رہنے کا حکم اس لئے ملا کہ عقل کا وجود دین کے بغیر محال ہے اور دین علم سے حاصل ہوتا ہے۔

ہر زندہ شئ وجود اور عقل رکھتی ہے اور ہر زندہ شئی ان قوانین پر عمل کرتی ہے جو اس کے لئے معین کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں کچھ قوانین ایسے ہیں کہ جن کو کشف کرنے کے لئے انسان کو جستجو اور تجربہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ چیزیں اپنے قوانین کے مطابق حرکت کرتی ہیں۔ اور ان کی حرکت میں کوئی عیب بھی نہیں ہوتا ہے۔

تمام مخلوقاتِ عالم ان قوانین و ضوابط کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، جو قانون اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے معین کئے ہیں۔

مثال: الیکٹرون اور پروٹون اگرچہ کم عقل مخلوق ہیں لیکن ان کی حرکت میں کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے قوانین کا علم رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں اپنے قوانین کا علم نہ ہو تو وہ اس نظم و ضبط کے ساتھ حرکت نہیں کر سکتے۔

جب کسی نے امیر المومنین سے سوال کیا کہ ہم تقویٰ کیسے حاصل کریں۔ تو امام نے جواب دیا کہ

"تقویٰ کو تقویٰ کے ذریعہ سے حاصل کرو"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر تقویٰ کا بیج پہلے سے موجود ہے انسان کو صرف اس کو اچھے طریقے سے اس کی پرورش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ تناور درخت بن کر انسان کو سایہ دے۔

یعنی

"جو علم ہم کو دے کر پیدا کیا گیا ہے اس علم کو ہم مزید علم حاصل کر کے بڑھا سکتے ہیں۔"

نتیجہ :

عقل
تعریف ← قوتِ تسخیریہ
پہچان ← ۱۔ اللہ کی اطاعت
۲۔ جنت کے حصول کیلئے تگ و دو

یعنی :

صرف وہ انسان جنت میں جائے گا جو کہ اطاعتِ پروردگار کے ذریعہ تسخیرِ کائنات کی منزل پر پہنچ جائے گا۔

اطاعت خدا :

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو خلق کیا، تو اپنی خلافت عطا کر کے تمام مخلوقات کو اس کی اطاعت (سجدہ) کا حکم دیا۔ لیکن اس خلیفہ و جانشین سے صرف اور صرف اپنی اطاعت کا تقاضہ کیا۔ نیز یہ فیصلہ فرمایا کہ جو انسان اللہ تعالیٰ کا جتنا فرمانبردار اور مطیع ہوگا اللہ تعالیٰ اسے اسی قدر اپنی صفتوں اور قدرتوں کا مظہر بنا دے گا۔ اور اس کے اختیارات میں اسی قدر وسعت عطا فرمائے گا۔

ایک حدیث قدسی میں جسے ابن ابی جمہور احسائیؒ نے عوالی اللئالی کی چوتھی جلد کے صفحہ ۱۰۲ پر نقل کیا ہے اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح بندے کو اپنی قدرتوں اور توانائیوں کا مظہر بنا دیتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ :

لَا یَزَالُ العَبدُ یَتَقَرَّبُ إِلَیَّ
بِالنَّوَافِلِ والعِبادَاتِ حَتّیٰ :
اُحِبُّهٗ
فَإِذَا أَحبَبتُهٗ کُنتُ :
سَمعَهٗ الَّذِی یَسمَعُ بِهٖ
وَبَصَرَهٗ الَّذِی یَبصُرُ بِهٖ
وَیَدُہٗ الَّتِی یَبطِشُ بِهَا
وَرِجلَهُ الَّذِی یَمشِی بِهَا

میرا بندہ مستحب اور پسندیدہ اعمال، نوافل اور عبادتوں کے ذریعہ مجھ سے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ :
میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔
اور ______
جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو :
- میں خود ہی اس طرح اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ پھر وہ اپنے کانوں سے نہیں میرے واسطہ سے سنتا ہے۔
- میں خود ہی اس طرح اس کی بصارت بن جاتا ہوں کہ پھر وہ اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ میرے واسطہ سے دیکھنے لگتا ہے۔
- میں خود ہی اس طرح اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ پھر وہ اپنے ہاتھ سے نہیں بلکہ میری قدرت کے ذریعہ پکڑنے لگتا ہے۔

اور ______

- میں اس طرح اس کے پیر بن جاتا ہوں کہ پھر وہ اپنے پیروں سے نہیں بلکہ میری طاقت کے ذریعہ چلنے لگتا ہے

شیخ نراقیؒ نے جامع السعادات کی تیسری جلد کے صفحات ۱۷۹ سے ۱۸۰ پر اسی حدیث میں یہ عبارت بھی نقل کی ہے کہ:

وَلِسَانُهُ الَّذِیْ یَنْطِقُ بِهٖ

- میں خود ہی اس طرح اس کی زبان بن جاتا ہوں کہ وہ میری قدرت کے ذریعہ بولنے لگتا ہے۔

عبادت کا مفہوم:

سورہ الذاریات ۵۱ آیت نمبر ۵۶ میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ط

ہم نے جن و انس کو فقط عبادت کے لئے خلق کیا ہے۔

یہاں عبادت سے مراد یہ نہیں کہ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی کرو بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہیں تکامل کے لئے پیدا کیا ہے کائنات کی نشو و نما میں حصہ دار بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اللہ کا دست و بازو بننے کیلئے پیدا کیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے کہ:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا فرمائے گا" (سورہ محمدؐ نمبر ۴۷، آیت نمبر ۷)

اللہ کی مدد سے مراد یہ ہے کہ تم خود بھی ایسے قوانین کی پابندی کرو، اس کی اطاعت کرو اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں بھی ایسا ماحول پیدا کرو

کہ وہ روانی کے ساتھ ساتھ کمال کی طرف چل سکے۔ تاکہ لوگ یہ بہانہ اور عذر نہ کرسکیں کہ حالات ایسے تھے اور ویسے تھے۔ بلکہ سوسائٹی میں ایسے حالات پیدا ہوجائیں، ماحول ایسا بن جائے کہ نیکی فیشن بن جائے، نیک کام کرنا باعث فخر ومباہات ہو، نیک کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگیں مختصر یہ کہ لوگ نیک کام کو کرنا پسند کرنے لگیں۔

اس مرحلہ پر یہ جاننا ضروری ہے کہ عبدِ مطیع کو کن کن صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔ تاکہ خدا اسے اپنے جیسا بنالے۔

عقل مند اور عبادت گذار بندہ کی خصوصیات:

۱۔ عبدِ مطیع وعاقل رات بھر جاگتا ہے۔ اللہ کی یاد میں بیقرار رہتا ہے۔ یہ بے قراری اس کی نیند اڑادیتی ہے۔ اگر کبھی سو بھی جاتا ہے تو اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔

۲۔ اس کو کبھی تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا اور یوں اپنے اندر خدا کی پوشیدہ صفتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

۳۔ مومن کے لئے بلا وجہ اور غیر ضروری سونا عبادت نہیں۔ سونا ان لوگوں کے لئے عبادت ہے جو اگر جاگتے رہیں تو گناہ میں ملوث ہوجائیں۔ اگر مومن کے لئے سونا عبادت ہوتا تو ائمہ علیہم السلام بھی سوتے۔ جبکہ انہوں نے راتوں کو عبادتِ الٰہی اور دوسرے امور میں گزارا۔

۴۔ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔ کبھی مصیبت زدہ کی دلجوئی کرتا ہے۔ کبھی پریشان حال کی پریشانی کو دور کرتا ہے۔ کبھی لوگوں کے کاموں کی انجام دہی میں مشغول رہتا ہے۔ غرضیکہ وہ معاشرہ میں ایک متحرک اور فعال شخص کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ عبدِ مطیع وہ نہیں کہ جو خود تو نیک عمل کرے اور دوسروں کو اس کی

ترغیب نہ دے بلکہ وہ ایسا شخص ہے کہ جو معاشرہ کی ایسی خوش گوار طریقہ سے تربیت کرے کہ لوگ خدا کی اطاعت کرنے کو پسند کرنے لگیں اور ایسے حالات پیدا کرے کہ دوسروں کے لئے راستہ ہموار ہو۔

یہ کام ہے " یعبدون "، کا گویا عقل کی قوت کا صحیح استعمال اسی مقام پر انجام پاتا ہے

اطاعت کی منزل کا تصور :

اطاعت کی منزل کا تعین یہ قرار پایا کہ انسان کو خداوندِ عالم نے یہ آزادی نہیں دی ہے کہ جو اسکی مرضی میں آئے وہ کرے بلکہ یہ قانون بنایا ہے کہ تم عبادت کرو اور اپنے آپ کو میرے سپرد کر دو۔ جب تم اس منزل پر کامیاب ہو جاؤ گے تو میں تمہیں اپنی تمام قوتوں کا مظہر بنا دوں گا

اب یہ حق انسان کو نہیں کہ اللہ سے پوچھے کہ اُسے یہ منزل کیوں نہیں ملی، یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ کس کامیاب انسان کو کس طرح اور کس حد تک اپنی قوتوں کا مظہر بنائے؟ اس بات کو ہم مثالوں سے اس طرح واضح کر سکتے ہیں

مثال ۱:

ایک طالب علم جو کہ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ اس کا کام ہے کہ وہ وقت کا خیال رکھے۔ اچھی طرح پڑھے۔ وقت پر امتحان دے اور بھرپور لگن سے اپنی قدرت اور توانائی کو انسٹیٹیوٹ کے سامنے پیش کر دے۔

اب یہ فیصلہ کرنا یونیورسٹی کا کام ہے کہ اُسے پاس کرے یا فیل کرے اچھے نمبر دے یا نہ دے۔ اب وہ یہ نہیں پوچھ سکتا کہ مجھے نو ۹ نمبر کیوں ملے اور دوسرے کو دس ۱۰ نمبر کیوں ملے؟

مثال ۲:

ہم جج کو یہ چیلنج نہیں کر سکتے کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں دیا؟ بلکہ ہمارا کام

یہ ہے کہ ہم اپنے دلائل بھرپور اور محکم انداز میں پیش کریں۔ اب وہ جو فیصلہ کرے گا، ہمیں اُسے خاموشی سے قبول کرنا چاہیئے۔

مہذب قوموں کی روش:

کوالیفائی کرنا مہذب قوموں کی نشانی ہے۔ اگر ایک یونیورسٹی ایک سال میں ایک ہزار ماسٹرز نکالتی ہے۔ ان ایک ہزار ماسٹرز میں سے صرف ۵ کو یونیورسٹی میں لیکچرر شپ ملتی ہے کیا اب یہ ایک ہزار افراد کوالیفائی کرنا چھوڑ دیں کہ ہم نہیں پڑھیں گے کیونکہ سروس صرف ۵ کو ملتی ہے۔ یہ جاہلانہ روش ہے۔

انسان صرف اِس خیال سے نہ پڑھے کہ اس کو سروس ملے گی یہ غلط ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اور مہذب قومیں یہ نہیں سوچتیں کہ ہم کیوں پڑھیں؟ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ پڑھنا لکھنا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ ایک انسان کے لئے علم کھانے پینے اور مادی وسائل سے زیادہ ضروری ہے۔ جاہل اور پڑھے لکھے میں اِس حد تک فرق ہے کہ ایک پڑھے لکھے انسان کے ہاتھ کے پکوڑے جاہل کے ہاتھ کے پکوڑوں سے اچھے ہوں گے۔

امریکہ میں بھی بے روزگاری ہے۔ یورپ اور پاکستان میں بھی۔ امریکہ کا جوان یہ نہیں کہتا کہ میں پڑھ کر کیا کروں گا، جبکہ پاکستان کا جوان یہ کہتا ہے کہ میں پڑھ لکھ کر کیا کروں گا؟ نوکری تو ملے گی نہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اگر وہ پڑھ لکھ کر بے کار بھی رہا تو بھی جاہل کے مقابلے میں گھر، خاندان اور قوم کے لئے بہتر فرد ثابت ہوگا۔

لہٰذا یہ سوچنا ہمارا کام نہیں ہے کہ ہمیں وہ مقام کیوں نہیں ملا جو دوسرے کو ملا ہے۔ یہ خدا کا کام ہے کہ کس کوالیفائیڈ کو کس کام کے لیے منتخب کرتا ہے؟ کیونکہ خدا نے ہمارا یہ فریضہ قرار نہیں دیا کہ ہم نتیجہ حاصل کریں۔ ہمارا

فریضہ یہ قرار پایا کہ کوالیفائی کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ کہیں بھی قرآن میں یہ بات نہیں ملتی کہ انسان اپنے نتیجہ کا ذمہ دار ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے۔ کہ انسان اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ ہم نے نماز ادا کی تو یہ قبول ہو گی یا نہیں؟ ہمارا کام ہے کہ ہم نماز کو خضوع و خشوع کے ساتھ پڑھیں۔ قبول ہوئی یا نہیں ہوئی یہ اللہ کا کام ہے۔

اسلام کی مشقوں، عبادتوں یا ریاضتوں میں یہ نہیں ہے کہ کام نتیجہ کے لئے کرو۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ تم کام یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ کرو۔ تمہیں جو اجر ملے گا وہ تمہاری کوشش کا ملے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا اجر نہیں ملے گا کہ وہ رسول تھے۔ بلکہ اس کا ملے گا کہ انہوں نے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں اپنی استطاعت سے زیادہ مشقت اٹھائی

تسخیر کائنات کی قوت کا عطا ہونا:

خداوندِ متعال فرماتا ہے کہ تم کو جو تسخیر کائنات کی قدرت ہم نے عطا کی ہے۔ اُسے ایسے استعمال کرو کہ ہم سمجھ جائیں کہ تم کائنات پر حکمرانی کی لیاقت رکھتے ہو۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم تمہیں کس طرح اور کس حد تک قوت و اقتدار عطا کریں۔

جب انسان کوالیفائی کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے اجر کے طور پر اسے قوتِ تسخیر یہ عطا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں وہ جنت کا حقدار ہوتا ہے۔

جنت:

اب دیکھنا یہ ہے کہ انعام کے طور پر انسان کو جو جنت ملے گی۔ وہ کونسی جنت ہے۔

جنت کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ وہاں آرام ہوگا۔ دودھ کی نہریں ہونگی۔ پھل ہوں گے۔ حوریں ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

خدا کی جنّت دنیا جیسی نہیں ہے۔ بلکہ جنّت کی تعریف کرتے ہوئے خداوند عالم سورۂ زخرف میں ارشاد فرماتا ہے۔

یَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ۝ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ۝ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ ۝

اے خدا کے بندو!

آج تم میں سے ان لوگوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین و محزون ہیں، جو ہماری نشانیوں پر ایمان لائے اور ہمارے مطیع و فرمانبردار یعنی مسلمان رہے۔

تم سب، اپنی بیویوں یا شوہروں کے ساتھ جنت میں عزّت واحترام اور مسرت وشادمانی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، وہاں ان کے گرد سونے کی رکابیوں اور کوزوں کا دور چلے گا۔

اور وہاں وہ سب کچھ ان کو ملے گا جس کا ان کا دل چاہے اور جن سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں یا ان کا نفسِ مطمئنہ جس چیز کی خواہش کرے یا ان کی عقلِ سلیم جو چیز بھی طلب کرے، وہ بغیر لیت ولعل کے ان کو فراہم ہوگی، اور تم ہمیشہ وہیں رہو گے یہ وہ جنت ہے جو تمہارے اعمال صالحہ (علم نافع) کے نتیجہ میں تمہیں علمی ورثہ کے طور پر ملی ہے اور اس میں تمہارے کھانے کیلئے طرح طرح کے پھل ہیں تمہارے ہر عمل کا نتیجہ موجود ہے۔

(سورہ زخرف ۴۳ آیات ۶۸-۷۳)

گویا ان آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ :

"جنت تسخیرِ کائنات ہے اس میں انسان کے لئے ہر وہ چیز ہوگی جس کا دل چاہے۔ یعنی جو عقل سلیم کے نزدیک ضروری مناسب اور مفید ہو نہ یہ کہ جو ہوا و ہوس اور وقت گزرانی کے لئے ہو۔ یہ ایسی چیزیں ہوں گی جو اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوں گی۔"

لہٰذا
جنت کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے۔

"کائناتی اقتدار کی منزل کا نام جنّت ہے۔"

یا پھر یہ کہ
"جنّت تسخیرِ کائنات کا انتہائی مرحلہ ہے۔"

یا اس طرح کہ
"کائنات پر تسلط کا نام جنّت ہے۔"
یعنی یہ کہ صرف وہ انسان جنّت میں جائے گا۔ جو عقل کی قدرت سے تسخیرِ کائنات کی منزل پہ پہنچ جائے گا۔

سورہ فجر کی آخری آیات کریمہ میں اس بات کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي

وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ۔
اے نفسِ مطمئن یعنی اے وہ عاقل انسان جو دنیا
کی کشمکش سے گھبرایا نہیں اور ہر حال میں مطمئن اور
پرسکون وخوش وخرم رہا۔ اب جبکہ تو اس سخت
امتحان میں کامیاب ہوگیا اور تو نے ثابت کردیا کہ تو بیجا
تمنائیں نہیں کرتا، خیالی پلاؤ نہیں پکاتا، اپنے افکار صالحہ
کو خود عمل کی بھٹی میں پکانے کی قدرت رکھتا ہے۔
تو شاباش اب تو ایسی منزل پہ ہے کہ میں تجھ سے
کہوں اس لئے تجھ کو دعوت دے رہا ہوں کہ:
آ! خوشی خوشی اپنے رب کی جانب لپک!
اب تو میرے خالص بندوں کی صف میں داخل ہو
کر میری جنت میں آجا!

(سورہ فجر ۸۹ آیات ۲۷-۳۰)

اب جبکہ انسان نفس مطمئنہ کی منزل پر فائز ہوکر جنت میں جارہا ہے
تو وہاں وہ بے جا فضول اور ہوس رانی کی خواہشیں نہیں کرے گا بلکہ اس
کا یہ عاقل اور مطمئن نفس ہر حال میں پاکیزہ اور عاقلانہ خواہش ہی کرے گا
جو محض تخیلاتی نہیں بلکہ عملی اور مفید ہوں گی۔

مثال:
۱۹۶۹ئہ میں آرم اسٹرونگ پہلا شخص تھا جو کہ چاند پر قدم جما کر آیا
آخر اس کی کیا وجہ ہے؟
اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی انسان کو خلاء میں بھیجنا ہوتا ہے تو پہلے خلاء
میں جانے والوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔ پھر ناسا میں داخلہ دیا جاتا ہے پھر

کئی ہزار میں سے ۱۰۰ کا انتخاب کرتے ہیں۔ پھر ۸۰ کا اور اسی طرح کم ہوتے جاتے ہیں۔ ۸۰ سال میں صرف دو ایسے جری آدمی پیدا ہوئے کہ ان کو مشن دیا اور کہا کہ تم چاند پر چلے جاؤ۔

وہاں پر جو ٹریننگ دی جاتی ہے اس کے مختلف انداز یہ ہیں:

۱۔ اس طرح ٹریننگ دی جاتی ہے کہ ایک ایسے کمرے میں خلاباز کو بھیجا جاتا ہے جس میں ایک جھولا لگا ہوتا ہے۔ یہ جھولا بٹن سے چلتا ہے۔ اُس جھولے میں اُسے بٹھا دیا جاتا ہے اور بٹن سے اُسے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اب یہ انسان کے بس میں ہے کہ بٹن کے اختیار کو اپنے اختیار سے کمزور کر دے۔

۲۔ اس کے علاوہ ایک گلوب کے اندر کرسی پر خلاء باز کو بٹھا دیا جاتا ہے۔ اور اُسے چاروں طرف سے رسی سے کس دیا جاتا ہے۔ اور منظر ایسا ہوتا ہے کہ دن میں تارے نظر آجائیں۔ خلائباز شکنجے میں جکڑا ہوا بے اختیار ہو جاتا ہے اور ایک سیکنڈ میں اسے متعدد سمتوں میں حرکت دی جاتی ہے۔ جس سے دماغ ہل جاتا ہے۔ اس ٹریننگ کو اچھے خاصے لوگ نہیں کر پاتے۔ وغیرہ وغیرہ

اتنی ایکسرسائز صرف چاند پر قدم رکھنے والے کو کرائی جاتی ہے۔ اب ذرا تصور کریں کہ جب کائنات کو تسخیر کرنے کی بات آئے گی تو انسان کو کتنی محنت و ریاضت کی ضرورت ہوگی۔ جنت میں جانے کے لئے کتنی پریکٹس کی ضرورت ہوگی۔ اتنی پریکٹس کر چکا ہو کہ جب عالمِ برزخ کے ۳۰ کروڑ سے بھی زیادہ شعلے اُسے چھوئیں تو وہ اُسے ہوا کے جھونکے معلوم ہوں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک انسان کو الیفائی کہہ جاتا ہے اور وہ کائنات پر تسلط حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہ اس اقتدار کا حامل ہونے کے باوجود ایک قیدی کی حیثیت سے کیوں زندگی گزارتا ہے۔

حدیث میں بھی ہے کہ

"دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔"

اس سوال کا جواب اس طرح سے دیا جاسکتا ہے کہ قیدی ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کی قدرت سلب کرلی جاتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی اس قدرت کا اظہار نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ قدرت کے اظہار کا حق نہیں رکھتا ہے۔ قدرت کا اظہار سسٹم کے خلاف ہے۔

"عقلمند وہ نہیں ہے جو سسٹم کے خلاف چلنا شروع کردے۔ بلکہ عقلمند وہ ہے جو سسٹم کا تابع ہو۔ بنانے والے کا فرمانبردار و مطیع ہو۔"

کائنات کے خالق نے کائنات کے تکامل کے لئے، اس کی بقا کیلئے جو سسٹم مقرر کر دیا ہے۔ جو بھی قوانین بنا دیئے ہیں ہمیں اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک گھر ہے اور اس میں ضرورت کے تحت مختلف کمرے ہیں۔ ہمارے پاس اختیار ہے کہ ہم چاہیں تو ڈرائنگ روم میں نہانا شروع کر دیں اور واش روم میں مہمان کو بٹھا دیں۔ مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اگر کوئی یہ بات کہے گا بھی تو اس کا سننا بھی برا لگے گا۔ اس لئے کہ یہ بات آداب معاشرت اور عقل کے خلاف ہے۔

یا دوسری مثال اس طرح سے دی جاسکتی ہے کہ فرض کریں ہم نے ۱۴ لاکھ کی گاڑی خریدی۔ اب ہم کہیں کہ ہم تو اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اس کو چلائیں گے یا برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر چلائیں گے۔ اس طرح وہ گاڑی نہیں چل سکتی چاہے وہ کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہو۔ اس کے چلانے کا جو سسٹم ہے وہ اسی کے مطابق حرکت کرے گی۔ عقل سسٹم کے خلاف حرکت نہیں

کرتی ہے۔ بلکہ اس کی اطاعت کرتی ہے۔

انبیاء و ائمہ علیہم السلام کی سیرت میں بھی ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ کسی بھی امام نے اعلانیہ یہ نہیں کہا کہ ہم مٹی کو سونا بنا سکتے ہیں یا زمین و آسمان پر قدرت رکھتے ہیں، مگر کبھی کبھار ضدی لوگوں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اُنکی ضد کو پورا کرنے کے لئے معجزہ کی صورت میں اللہ کے حکم سے اس کی عطا کی ہوئی قدرت کا اظہار کیا۔

جنت اور دنیا کا فرق :

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جنت میں انسان کو بغیر کسی کوشش کے سب کچھ مل جائے گا۔

لیکن یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ اصولی طور پر جنت میں اس دنیا سے زیادہ سخت کوشش اور جدوجہد کرنا پڑے گی۔

کیونکہ قانون قدرت یہ ہے کہ زندگی کے تکامل کے ساتھ مشقتوں اور دائرہ کار میں اضافہ ہی ہوتا ہے، کمی نہیں آتی۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنت اور دنیا میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جنت اور اس دنیا کا فرق یہ نہیں ہے کہ یہاں کوشش کرنا پڑتی ہے اور وہاں کوشش نہیں کرنا پڑے گی۔

بلکہ فرق یہ ہے کہ :

۱۔ یہاں انسان جو کوششیں کرتا ہے ضروری نہیں ہے کہ ان کوششوں کا نتیجہ وہی نکلے جس نتیجہ کے لئے کوششیں کی جائیں۔

لیکن،

جنت میں انسان کی کوششوں کا ہمیشہ وہی نتیجہ نکلے گا، جس کے لئے کوشش کی گئی ہو گی۔

کیونکہ

دنیا ———— آزمائش کی جگہ ہے۔
اور ———— سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ جب نتیجہ
کوشش کے مطابق نہ ہو تو انسان اللہ تعالیٰ کا
شکر ادا کرے

اور،

جنت ———— اجر و جزاء کی جگہ ہے،
اس لیے وہاں ہر کوشش کا نتیجہ وہی ہوگا۔
جس کے لئے کوشش کی گئی ہو۔

۲، دنیا میں انسان کو عموماً پہلے اپنی پھر دوسروں کی فکر ہوتی ہے۔ مگر جنت میں انسان کو اپنی فکر ہی نہیں ہوگی۔ ہمیشہ دوسروں ہی کی فکر ہوگی۔

یعنی وہاں انسان کو جو بھی نعمتیں ملیں گی وہ ان کو دوسروں کو دے کر خوش ہوگا، وہاں اپنے پاس جمع رکھنے کا شوق نہیں ہوگا۔

۳، دنیا میں انسان کوشش سے تھک جاتا اور کمزور پڑجاتا ہے مگر جنت میں انسان کو کوشش اور محنت میں لذت ملے گی اور خوشی محسوس ہوگی۔

دنیا میں انسان اپنے لیے کوشش اور محنت سے تھک جاتا ہے۔ لیکن جنت میں انسان اللہ کے دوسرے مخلوقات کے لیے محنت و مشقت کرنے اور کوشش کرنے میں لذت، خوشی، نشاط اور فرحت محسوس کرے گا، وغیرہ وغیرہ۔

تسخیرِ کائنات کی قوّت کا استعمال کیسے؟

اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ تسخیرِ کائنات کا فریضہ انجام دے یا وہ خدا کا خلیفہ بننے کی قوت دلیاقت پیدا کرلے تو اُسے چاہیئے کہ اپنی عقل کو استعمال کرنا سیکھے۔

کیونکہ!

"جنّت کا حصول جو کہ اطاعتِ خدا کے نتیجہ میں تسخیرِ کائنات کا اجر ہے۔ بغیر عقل کی حرکت کے ممکن نہیں۔"

عقلِ انسانی کی پہلی حرکت کا نام سوچ ہے۔ ایسی سوچ جو کہ معلوم سے مجہول کی طرف ہوتا کہ مجہول کو کشف، دریافت یا معلوم کرسکے۔ یعنی ضروری ہے کہ یہ حرکت بامقصد بھی ہو اور صحیح سمت میں بھی نیز صحیح طرح بھی انجام پائے۔

عقل کی خوبی یہ ہے کہ وہ مجہولات کو منکشف کرتی ہے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کو خدا نے فرشتوں کے سامنے پیش کیا تو اُن کو دی ہوئی قدرت د توانائی کے بارے میں فرشتوں نے کہا:

"اے اللہ! تو نے اُسے ایسی قدرت دی ہے اور ایسے معلومات عطا فرمائے ہیں کہ وہ انکی مدد سے نئے معلومات کو حاصل کرنیکی قدرت رکھتا ہے۔ جبکہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ جو تو نے ہمیں دیا ہے۔ ہم اس میں اضافہ نہیں کرسکتے تو نے ہم کو وہ توانائی نہیں دی کہ ہم آگے سوچ سکیں اور آگے بڑھ سکیں۔"

کیونکہ:

انسانی عقل کی خوبی یہ ہے کہ وہ مجہولات کو منکشف کرتی ہے۔

علم
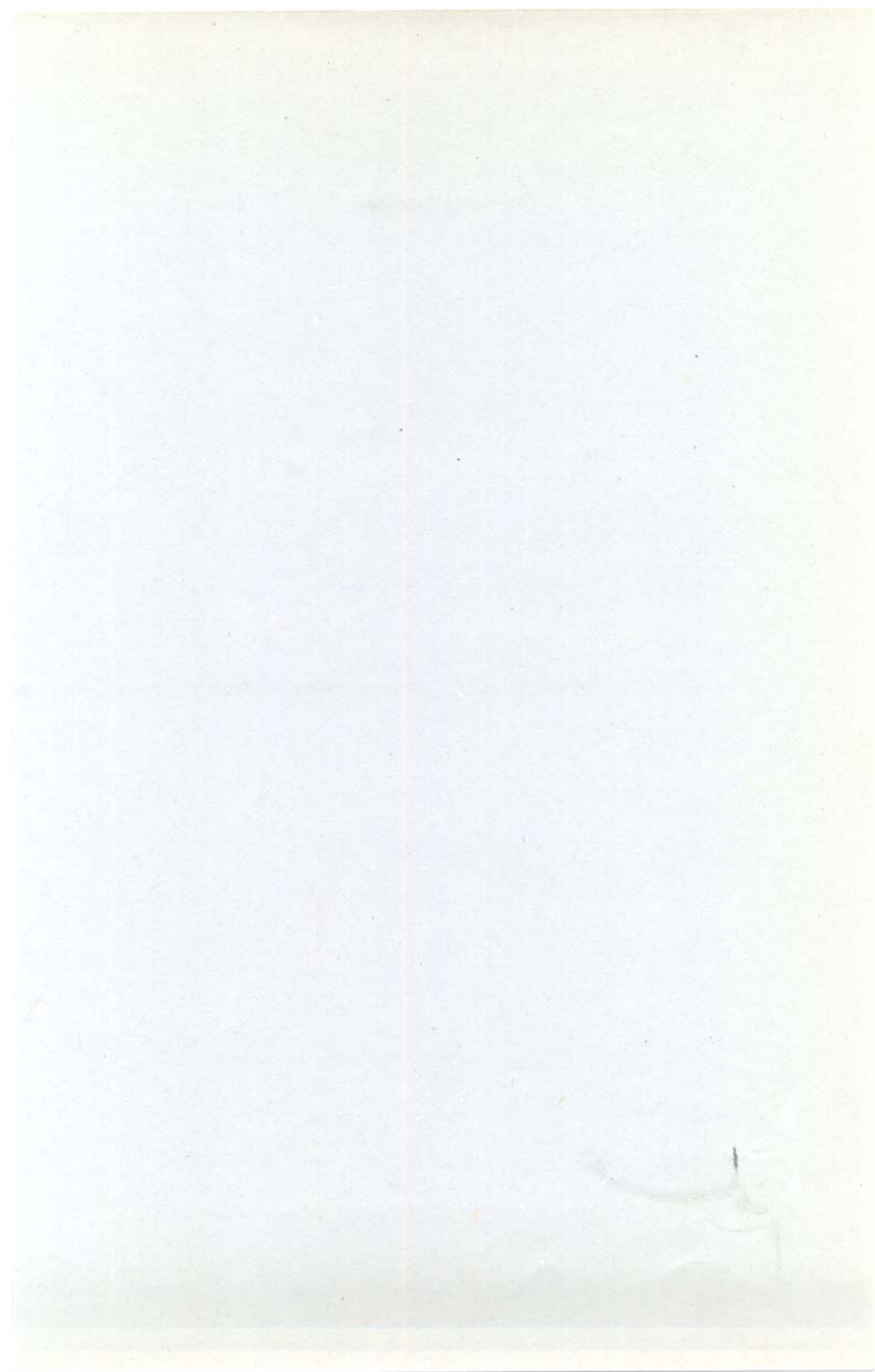
عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ علم معلومات کے مجموعہ کا نام ہے، بالفاظ دیگر کسی خاص نظم و ترتیب یا سسٹم کے تحت کسی موضوع سے متعلق معلومات کے مجموعہ کو علم سمجھا جاتا ہے۔

اس عمومی اصطلاح میں علم کو:

۱۔ دنیاوی و دینی
۲۔ طبیعی و مابعد الطبیعاتی
۳۔ نظری / فکری و عملی / تجربی

وغیرہ میں تقسیم کرتے ہیں۔

اسلام کی نظر میں علم کی یہ تعریف اور تقسیم دونوں غلط ہیں۔

علم کی تعریف

اسلام کی نظر میں، علم، فقط معلومات یا ان کے مطابق عمل کرنے کا نام نہیں ہے علم، اس بھٹی سے نکلے ہوئے، تیار شدہ مال کا نام ہے۔ جسے عقل اپنے کارخانہ میں تکامل کے مختلف مراحل سے گزارنے کے بعد سجا بنا اور چمکا دمکا کر پیش کرتی ہے۔

گویا،

علم، تفکر کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے ذخیرۂ معلومات کے کارخانۂ عقل و خرد میں مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ایسے خوبصورت اور دلربا زیور کا نام ہے جو اصل شے کی ماہیت کو بدل کر اسے اعلیٰ اور پسندیدہ لباس پہنا دیتا ہے۔

چنانچہ،

انسان، جو کچھ پڑھتا، سنتا، سمجھتا اور کشف کرتا ہے۔ وہ سب معلومات ہوتے ہیں۔ عام زبان میں اسی کو علم کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ مجموعہ معلومات، علم کا پہلا زینہ، یا علم کے لیے خام مال کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب،

انسانی عقل ضروری معلومات جمع کرنے کے بعد، ان میں سے اچھے، برے، کامل، ناقص، مفید، مضر، ضروری، غیر ضروری وغیرہ کو الگ الگ کر کے، ان کو مرتب کرتی ہے، ان سے مفید نتائج حاصل کرتی ہے، پھر ان حاصل شدہ نتائج کو پختہ کرتی ہے، پھر انسانی اعضاء و جوارح کی مدد سے ان کو عمل کی بھٹی میں پکا کر ان پر صیقل کرتی ہے۔ اس صیقل اور پالش کے نتیجہ میں انسان کی شخصیت، انوارِ الٰہی کو مخلوقاتِ الٰہی پر منعکس کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اب یہ انسان نورِ الٰہی کی کرنوں کو اپنے اندر جذب کر کے انہیں بہت سلیقہ سے اپنے اردگرد کے ماحول، انسانوں، معاشرہ اور دوسری الٰہی مخلوق پر منعکس کرتا ہے۔ یہی انعکاس وہ علم ہے۔ جس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

"اَلعِلمُ نُورٌ، یَقذِفُہُ اللّٰہُ فِی قَلبِ مَن یَّشَاءُ"

علم سراسر روشنی، نور، نورِ الٰہی کا پرتو، چمک اور قلبِ سلیم و عقلِ سلیم کو منور و تاباں رکھنے والی کرنوں کا نام ہے، اور یہ

کرنیں اللہ کی دین و عطا کے بغیر نہیں ملتی ہیں۔

اور،

اسی بنیاد پر حدیث میں آیا ہے۔
اگر کسی کے علم کو پرکھنا چاہو تو یہ دیکھو کہ وہ کتنی مرتبہ اللہ اور رسُول کے قول کو نقل کرتا ہے۔
جو لوگ فقط اپنے خزانۂ معلومات کی وسعت کو علم سمجھتے ہیں اور اس پر ناز و گھمنڈ کرتے ہیں ان کے لئے قرآن حکیم علی الاعلان یہ فرما رہا ہے:
مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ......
جو لوگ توریت یعنی کتابوں کو پڑھ کر اپنے معلومات کے ذخیرہ کو تو بڑھا لیتے ہیں، لیکن اس پر عقلی مشقوں کے بعد عمل نہیں کرتے ان کی مثال ایسے گدھوں جیسی ہے جن پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ (سورۂ جمعہ ۶۲، آیت ۵)
اس بات کی اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہو سکتی ہے؟
اسی لیے اسلام کی اصطلاح میں عالم صرف وہی ہے جس کا عمل اس کے معلومات کے مطابق ہو اور جس کا عمل اس کے معلومات سے مطابقت نہ رکھتا ہو وہ عالم نما یا عالم سوء ہے عالم نہیں ہے۔
یہاں پر یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ علم خالص عقلی تحرک و فعالیت یا سرگرمی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے۔
اَلْعِلْمُ نُوْرٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِيْ قَلْبِ مَنْ يَّشَاءُ
علم ایسا انعکاس انوار الٰہی ہے جسے جب اللہ چاہتا ہے، تب ہی وہ کسی کے اندر سے پھوٹتا ہے۔
گویا علم خالص عقلی سرگرمی کے نتیجہ کی بارگاہ ربوبیت میں قبولیت

کے بعد اس کی عطا کے سبب حاصل ہوتا ہے۔

یعنی،

علم فقط کسبی چیز نہیں ہے، بلکہ کَسَب و وَھَب یعنی ذاتی تگ و دو اور عطاالٰہی کا مرکب نتیجہ ہے۔

یوں، ہماری نظر میں علم کی تعریف یہ ہے:

عقل انسانی کی حرکت کے نتیجہ میں انسانی شخصیت سے منعکس ہونے والے انوارِ الٰہی۔

اس کو نسبتاً وضاحت کے ساتھ یوں کہا جا سکتا ہے کہ:

"معلومات و مجہولات کے درمیان عقل انسانی کی مسلسل اور بامقصد حرکت یعنی تفکر و تدبر و عمل کے نتیجہ میں انسانی شخصیت سے منعکس ہونے والے انوار الٰہی کا نام علم ہے۔"

اسی علم کو ہم معرفت یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین بھی کہتے ہیں۔

علم کی قسمیں:

اس لیے:

اسلام نے علم کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

علم

نافع (مفید)

غیر نافع (مضر)

ہم اپنی گفتگو میں جہاں بھی علم کی اصطلاح بروئے کار لائیں گے، وہاں ہماری مراد علم نافع یا مفید علم ہوگی۔ علمِ مُضر کو ہم مراحل علمی کے دوران آنے والے انحرافات یا جمود سے تعبیر کرتے ہیں۔

عقل انسانی کی سرگرمیاں جب علم کی بلندی تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں، تو اس دوران جن حضرات کی عقلیں راستہ کی رکاوٹوں کے مقابلہ میں ناکام رہ کر کسی ایک مرحلہ پر رک جاتی ہیں، تو یہ ناقص علم، غیر نافع اور مضر علم بن کر عقل کے سامنے ایک ضخیم پردہ اور رکاوٹ کی صورت میں آکھڑا ہوتا ہے۔ یہی انسان کی جہالت، کج روی، فکری اور عملی گمراہی و ہٹ دھرمی کا سبب بنتا ہے۔ اسی قسم کے علم کو حدیث میں

"حجاب اکبر"

سے تعبیر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

اَلعِلمُ حِجَابٌ اَکبَرُ

ناقص، غیر مفید اور مضر علم عقل کے لئے پردہ اور رکاوٹ کا کام کرتا ہے۔

اصطلاحات و اشارات
اور اُن کے مفاہیم

جیساکہ اب تک کی گفتگو سے اندازہ ہوا، انسان ایک انتہائی قوی عقل کا مالک ہے اور عقل اسے علم کی اس بلندی پر پہنچاتی ہے جس کے ذریعہ نہ صرف وہ کائنات کے پوشیدہ اسرار کو کشف کر کے کائنات پر اپنے اقتدار اور حکمرانی کا طبل بجاتا ہے، بلکہ عبودیت واطاعتِ الٰہی کی منزلوں کو طے کر کے انوارِ الٰہی کے پر تو کا حامل بننے کی قدرت بھی حاصل کر لیتا ہے۔

اس لئے ہر انسان کی ابتدائی ضرورت یہ ہے کہ وہ عقل اور اس کی قدرتوں کو پہچانے، اس کی ان سرگرمیوں اور حرکات وسکنات کی پیچیدگیوں کو درک کرے جس کے نتیجہ میں انسان جہالتوں کی تاریکیوں سے علم کی نورانیت تک سفر کے منازل طے کرتا ہے، تاکہ وہ جہالت سے علم تک کے سفر اور اس سفر کے دوران آنے والی مشکلوں سے لطف اندوز ہو سکے۔

معلوم سے نامعلوم اور پھر نامعلوم کے انکشاف کے بعد اس کی افادیت واہمیت تک رسائی، اس کے بعد اس کے عملی تجربات کے ذریعہ مفیدِ انسانیت نتائج کا حصول عقلی سرگرمیوں کے بغیر ناممکن ہے۔

ان عقلی سرگرمیوں کی پہلی سیڑھی تفکر ہے۔ اس لئے ہم نے تفکر و تدبر کے پیچیدہ عمل کو عام فہم بنانے کے لئے کچھ اشارے اور اصطلاحیں وضع کی ہیں اُن کی مدد سے نہ صرف یہ پیچیدہ عمل آسانی سے سمجھ میں آنے لگتا ہے، بلکہ اس کے لئے ایسے قاعدۂ کلیہ یا قانون کا وضع کرنا اور بنانا آسان ہو جاتا ہے، جو بلکتی ہوئی انسانیت کے لئے اس عظیم الشان الٰہی خزانہ کے دروازوں کو کھولنے کے لئے ریموٹ کنٹرول جیسی چابی کا کام کرے۔

کیونکہ،

تفکر ایک ایسا عمل ہے جو ہر سن و سال نیز ہر علمی سطح کے انسان کی ابتدائی ضرورت ہے۔ بچہ بھی تفکر ہی کے ذریعہ اپنے ارد گرد کے ماحول کو پہچانتا ہے، جوان اور بوڑھا بھی اسی سیڑھی پر چڑھ کر اپنے مسائل کا حل تلاش کرتا اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کم پڑھے لکھے افراد بھی کشمکش حیات میں تفکر ہی کے سہارے اپنی زندگی گزارنے کے حق کو حاصل کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے حضرات بھی تفکر ہی کے ذریعہ قادر مطلق کی بے کراں کائنات کی گہرائیوں میں تیرنے اور بلندیوں میں پرواز کرنے کے بعد ہی زندگی کے حقائق تک رسائی حاصل کر کے انسانیت کی فلاح کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

اس لئے،

ہم عقلی سرگرمیوں کی پیچیدگیوں اور طور طریقوں کے کلیات کی وضاحت سے پہلے، ان اشارات و اصطلاحات کی توضیح ضروری سمجھتے ہیں جو ہم نے اس سلسلہ میں وضع کی بنائی اور اپنائی ہیں۔ واضح رہے کہ ہم نے ہر اصطلاح کیلئے ایک اشارہ وضع کیا ہے اور اس کے لئے ایک مفہوم اور معانی معین کئے ہیں۔ یہاں ہم ان کو بیان کر رہے ہیں۔ اس کے بعد جہاں کہیں ہم ان اشارات کو استعمال کریں گے وہاں ان سے یہی اصطلاحات ان بیان شدہ مفاہیم

کے ساتھ مراد ہوں گے ممکن ہے ہم نے اپنی بنائی ہوئی اصطلاحوں کے لئے جو الفاظ معین کیئے ہیں، دوسرے علوم وفنون، اہل لغت یا علماء کی نظر میں ان کے معانی اس سے مختلف ہوں۔ اس لئے ان کی وضاحت ضروری ہے

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
۱	ا	اللہ تعالیٰ	اللہ تعالیٰ، قادر مطلق، وجود محض، خالق کون ومکان، وہ قدرت جو تمام قدرتوں سے مافوق ہے اور جس کا اعتراف ہر انسان کرتا ہے خواہ وہ کسی دین کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو۔ خواہ اس کا تصور موہوم ہو، شعوری ہو یا لاشعوری، ہر انسان بلا تفریق مذہب وملت اس کی قدرت اور اس قدرت کی کارفرمائیوں کا اقرار کرتا ہے مگر سب نے اپنے اپنے ماحول اور اپنی اپنی فہم وپسند کے مطابق اس کے نام الگ الگ رکھے ہوئے ہیں۔
۲	آ	آیات الٰہی	تمام مخلوقات، اللہ تعالیٰ کی نشانیاں یعنی آیات الٰہی ہیں۔ ان ہی آیات الٰہی پر غور وفکر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ پر انسان کا ایمان پختہ ہوتا ہے۔

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
۳	خ	خلوص	خلوص سے ہماری مراد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنی تمام تر توانائیوں کو مخلوقاتِ الٰہی کی بہتری کے لیے بروئے کار لانا ہے۔ اس کے بدلہ میں کسی سلوک یا شکریہ یا اجر کی تمنا نہ ہو۔
۴	ت	نیت	وہ پختہ اور مضبوط ارادہ جو کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انسان کو عمل کی انجام دہی کی قدرت عطا کرے اور اس سے اس عملِ صالح کو انجام دلوائے۔
۵	(خ + ت)	خلوص نیت	عمل صالح کو انجام دینے کا ایسا مضبوط اور پختہ ارادہ جس میں شعوری اور لاشعوری طور پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ کے مخلوقات کی فلاح و اصلاح و تکامل کے علاوہ کوئی عنصر شامل نہ ہو اور نہ ہی اس عمل کے بدلہ میں کسی اچھے برتاؤ، شکریہ، اجر یا عوض کی تمنا ہو۔
٦	ک ⩔	تفکر	اگرچہ ہماری نظر میں انسان کے وہ تمام اعمال جو عقل کے مطابق اور اطاعتِ الٰہی کیلئے ہوں، اسی دائرہ میں آتے ہیں

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
			لیکن ! یہاں اس اصطلاح سے ہماری مراد عقل کے وہ پانچ پہلے حرکات ہیں جن کے نتیجہ میں وہ مجہولات کو منکشف کر کے معلومات میں بدلتی ہے۔ عقل کی ان پانچ حرکتوں کو ہم نے "پنجگانہ حرکات" کا نام دیا ہے اور انہیں تفکر کے نشان کے طور پر ہم نے درج ذیل شکل میں پانچ لائنوں یا خطوں کی صورت میں وضع کیا ہے۔ ⩔ دوسری لفظوں میں ہم اسے تدبر و تعقل بھی کہتے ہیں۔ (شکل ۔ ۵)
۷	ز	مخزن	انسانی دماغ کا وہ حصہ جہاں پیدائش کے وقت ابتدائی معلومات موجود ہوتے ہیں۔ جن کی مدد سے انسانی عقل مجہولات کو منکشف کرتی ہے۔ پھر یہیں نئے معلومات جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اسے ہم معلومات کا خزانہ، مخزنِ معلومات، عقل کا مسکن اور انسانی عقل کی حرکتوں کا نقطۂ آغاز کہتے ہیں۔ (شکل ۔ ۵)
۸	لا	مجہولات	وہ تمام اشیاء ومفاہیم جو کسی انسان کو معلوم نہ ہوں۔ (شکل ۔ ۵)

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
۹	ش	انکشافات	عقل کا کمرۂ تحقیق، لیبارٹری، جہاں عقل موجودہ معلومات کے ذریعہ ان مجہولات پر کام کرتی ہے۔ جن کو کشف کرنا ہوتا ہے تاکہ معلومات کے خزانہ میں نئے معلومات یا انکشافات کا اضافہ کرے۔ اسی سے مراد وہ معلومات بھی ہیں جو عقل اپنی اس سرگرمی کے ذریعہ منکشف کر کے مخزن کی طرف لاتی ہے، یعنی نئے معلومات یا انکشافات۔ (شکل ۵)
۱۰	و	والو ز ← لا	مخزن، موجودہ معلومات کے ذخیرہ یا عقل کے مسکن کا پہلا خودکار دروازہ۔ یہ دروازہ والو کی طرح خودکار اور یک طرفہ ہے اس لیے اسے والو ہی کا نام دیا ہے۔ یہ والو ہمیشہ باہر کی سمت کھلتا ہے۔ نیز یہ کہ اس کی سمت فقط مجہولات ہی ہے، یعنی اس دروازہ سے عقل اپنے مسکن سے صرف مجہولات ہی کی طرف جا سکتی ہے۔ کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتی۔ اور نہ ہی اس والو سے پلٹ سکتی ہے۔ (شکل ۵)

مفاہیم	اصطلاحات	اشارات	نمبر شمار
مخزن کا دوسرا خودکار دروازہ۔ یہ دروازہ بھی والو کی طرح ہے۔ یہ والو ہمیشہ اندر کی طرف کھلتا ہے۔ اس کی سمت فقط مجہولات سے مخزن کی طرف ہے۔ یعنی اس دروازہ سے عقل صرف مجہولات تک جانے اور ان کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد ان ابتدائی معلومات کے ساتھ ہی مخزن میں آسکتی ہے۔ گویا، مجہولات کو مکمل طور پر منکشف کرنے کے بعد وہ اس والو سے مخزن میں داخل نہیں ہوسکتی۔ (شکل ۵)	والو لا ← ز	ل	۱۱
مخزن کا تیسرا خودکار دروازہ۔ یہ دروازہ یا والو اگرچہ والو "ل"، کی طرح فقط باہر کی طرف کھلتا ہے۔ لیکن اس کی سمت "لا"، کے بجائے "ش"، یعنی کمرہ تحقیق یا لیبارٹری ہے۔ جہاں پر عقل پرانے اور نئے معلومات پر غور کرتے ہوئے مجہولات کو منکشف کرتی ہے۔ اور مخزن میں نئے معلومات کے	والو ز ← ش	ج	۱۲

مفاہیم	اصطلاحات	اشارات	نمبر شمار
اضافہ کی تیاری کرتی ہے۔ (شکل نمبر ۵)			
مخزن کا منفرد اور اکلوتا دروازہ جو فقط اندر کی طرف کھلتا ہے۔ لیکن خود کار نہیں ہے: ۱۔ یہ دروازہ بنیادی طور پر ہمیشہ بند رہتا ہے۔ ۲۔ یہ دروازہ اس وقت تک نہیں کھلتا جب تک کوئی انسان نئے معلومات کے حصول کے لیے اسے خود سے نہ کھولے۔ ۳۔ یہ دروازہ صرف اسی وقت کھل سکتا ہے۔ جب عقل نئے معلومات لے کر واپس آئے اور دستک دے۔ ۴۔ یہ دروازہ اگرچہ کھولے بغیر کھل نہیں سکتا لیکن کھلنے کے بعد فوراً ہی خود بخود بند ضرور ہو جاتا ہے۔ ۵۔ جب اس دروازہ کو کھولا جاتا ہے تو یہ عقل کو فقط ایک ہی دفعہ نئے معلومات کے ساتھ آنے کی اجازت دیتا ہے اور فوراً بند ہو جاتا ہے۔	دروازہ	د	۱۳

مفاہیم	اصطلاحات	اشارات	نمبر شمار
۶۔ اس لئے ہر دفعہ نئے معلومات کے حصول کے لیے اسے خود سے کھولنا پڑتا ہے۔ ۷۔ اس دروازہ سے فقط نئے معلومات داخل ہو سکتے ہیں خارج نہیں ہو سکتے (شکل ۵)			
جب عقل تفکر کے نتیجہ میں مجہولات کو منکشف کرتی ہے۔ تو یہ نئے معلومات لے کر واپس مخزن میں آتی ہے، اور ان نئے معلومات کو مخزن میں رکھتی ہے یوں انسان کے معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔	معلومات میں اضافہ	ض	۱۴
معلومات میں ہر اضافہ کے بعد عقل تمام معلومات کو نئے سرے سے مرتب کرتی ہے۔ کیونکہ معلومات میں ہونے والا ہر اضافہ انسان کے مجموعی معلومات سے حاصل کیے گئے نتائج پر اثر ڈالتا ہے، اس لئے ہر دفعہ نتائج پر نظر ثانی کے لئے تمام معلومات	ترتیب	ب	۱۵

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
			کو نئے سرے سے مرتب کرنا ضروری ہوتا ہے۔
۱۶	ق	تحقیق	معلومات میں ترتیب کے بعد عقل ان معلومات کے درمیان جستجو اور تحقیق کرتی ہے۔ تاکہ اچھے، بُرے، صحیح، غلط، کارآمد اور ناکارہ کی شناخت کا مرحلہ آسان ہو جائے۔
۱۷	ن	انتخاب	تحقیق کے بعد عقل ان معلومات میں سے اچھے، بُرے، صحیح، غلط، کارآمد اور ناکارہ معلومات کو منتخب کر کے الگ الگ سجاتی ہے۔ اس مرحلہ پر بھی عقل کسی قسم کے معلومات کو ضائع نہیں کرتی۔
۱۸	ر	تیاری	اس مرحلہ میں عقل انسان میں صحیح اور نتیجہ خیز، مثبت اور مفید مطلب معلومات کے حصُول کا شوق اجاگر کر کے اسے عمل پر ابھارنے کی کوشش کرتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان اچھی باتوں پر

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
			عمل کا ارادہ اور نیت کرتا ہے اور خود کو اس ارادہ کے مطابق عمل کے لئے تیار کرتا ہے۔
۱۹	ع	عمل	عمل سے مراد وہ عمل صالح ہے جو عقل معلومات کو تمام مراحل سے گزارنے کے بعد مخلوقات الٰہی کی فلاح کی خاطر انسانی اعضاء وجوارح کے ذریعہ انجام دیتی ہے یہ اعمال کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری طور پر انجام پاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی انسان اعمال کے سلسلہ میں شعوری طور پر اللہ کی اطاعت اور خوشنودی کا خواہاں ہوتا ہے کبھی یہ خواہش اور نیت لاشعوری اور ناآگاہانہ صورت میں ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لاشعوری اور ناآگاہ طور پر تو یہ کام اللہ کی اطاعت اور اس کی خوشنودی ہی کے لیے انجام پاتا ہے مگر شعوری طور پر انسان کا ارادہ اس کے خلاف ہوتا ہے۔

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
			پہلی صورت میں انسان کو دنیاوی و اخروی دونوں کائناتوں میں اجر بھی ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی: إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا (انسان ۷۶ آیت ۲۲) دوسری صورت میں فقط بدلہ ملتا ہے۔ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ (البقرہ ۲ آیت ۲۰۰) تیسری صورت میں کبھی کبھی سزا بھی ملتی ہے
۲۰	ذ	ذاتِ انسانی	ہر انسان کی اپنی ذات
۲۱	ہ	اہلیت	جب انسان بار بار اعمال صالحہ کو خلوصِ نیّت کے ساتھ انجام دیتا ہے تو وہ باطنی اور ظاہری طور پر اتنا شفاف ہو جاتا ہے کہ انوار الٰہی کی تجلی اور ان کے انعکاس کا اہل اور صلاحیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
۲۲	ی	تجلی	انسان پر انوارِ الٰہی کی تجلی انعکاس یا پرتَو
۲۳	س	انعکاس	جب انسان شعوری و لاشعوری ادراک اور خلوصِ نیت کے ساتھ اعمالِ صالحہ کو بار بار انجام دیتا ہے، غرور و تکبر نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے حضور خاضع رہتا ہے۔ تو، یہ تکرار و صداقتِ عمل اس کے ضمیر سے نکل کر اس کے اعضاء و جوارح سے پھوٹنا شروع ہوتی ہے۔ اس انعکاس کے سبب اس میں ایسی ظاہری و باطنی شفافیت و تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت میں ایسا نکھار اور صیقل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اوپر نازل ہونے والے انوارِ الٰہی کو مخلوقاتِ الٰہی پر منعکس کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔ گویا، انعکاس دو قسم کے ہیں: ۱۔ ایک وہ انعکاس جو صداقت اور مداومت

نمبر شمار	اشارات	اصطلاحات	مفاہیم
			اعمال صالحہ کے سبب انسان کے ضمیر سے نکل کر اس کی شخصیت اور اعضاء وجوارح سے پھوٹتا ہے۔ ۲۔ دوسرا وہ انعکاس جو پہلے انعکاس کے سبب پیدا ہونے والی شفافیت کے بعد تجلی انوار الٰہی کے نتیجہ میں انوار الٰہی کو خود میں جذب کر کے دوسروں پر منعکس کرنے کا کام کرتا ہے۔ اسلام کی نظر میں یہی دونوں انعکاس علم ہیں جسے نور کہا گیا ہے۔ کیونکہ، ضمیر انسانی میں بھی دراصل انوار الٰہیہ ہی پوشیدہ ہوتے ہیں جو صداقت و مداومت عمل کے نتیجہ میں انسان کے ضمیر سے نکل کر اس کے اعضاء وجوارح اور شخصیت سے پھوٹتے اور منعکس ہوتے ہیں، پھر یہ انوار الٰہی ان انوار الٰہی کے لیے کشش کا سبب بنتے ہیں جو ارادہ الٰہی سے انسان پر تجلی کرتے ہیں۔ اَلْعِلْمُ نُوْرٌ یَقْذِفُہُ اللّٰہُ فِیْ قَلْبِ

مفاہیم	اصطلاحات	اشارات	نمبر شمار
من یشاء اور اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورہ نور ۲۴، آیت ۳۵) کا مطلب یہی ہے۔			
عقلی سرگرمیوں کے نتیجہ میں صحیح اور مفید ترین معلومات کے مطابق خلوص نیت کے ساتھ بار بار اعمال صالحہ انجام دینے کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیت گویا، انعکاس ہی دراصل علم نافع ہے۔ علم نافع، معرفت، الیقین، بندگی، ایمان نور سب مرادف اور ہم معانی ہیں۔ علم نافع کے لئے ہم نے جو نشان وضع کیا ہے وہ عقل کے پنجگانہ حرکات اور پنجگانہ اعمال کو پوری طرح بیان کرتا ہے۔ وہ نشان یہ ہے:	علم نافع = معرفت = یقین = بندگی = ایمان = نور = انعکاس = تجلی	م	۲۴
سادہ ایک خط پر مشتمل سیدھا تیر اس بات کی نشانی ہے کہ یہ عمل انسان کا اختیاری عمل نہیں بلکہ طبیعی اور خود بخود انجام پانے والا عمل ہے۔	فطری اور طبیعی حرکت	←	۲۵

مفاہیم	اصطلاحات	اشارات	نمبر شمار
دو خطوں پر مشتمل تیر اس بات کی علامت ہے کہ یہ عمل یا حرکت انسان کے اختیار میں ہے۔	اختیاری عمل	⟸	۲۶
نیچے کی طرف جاتا ہوا دوہرے خط پر مشتمل تیر عمل یا نیت کی گہرائی یا عمل کی کیفیت پر دلالت کرتا ہے۔	گہرائی و عمق	⇓	۲۷

چار نشان

تفکر کا نشان
Logo 1
لوگو ۱
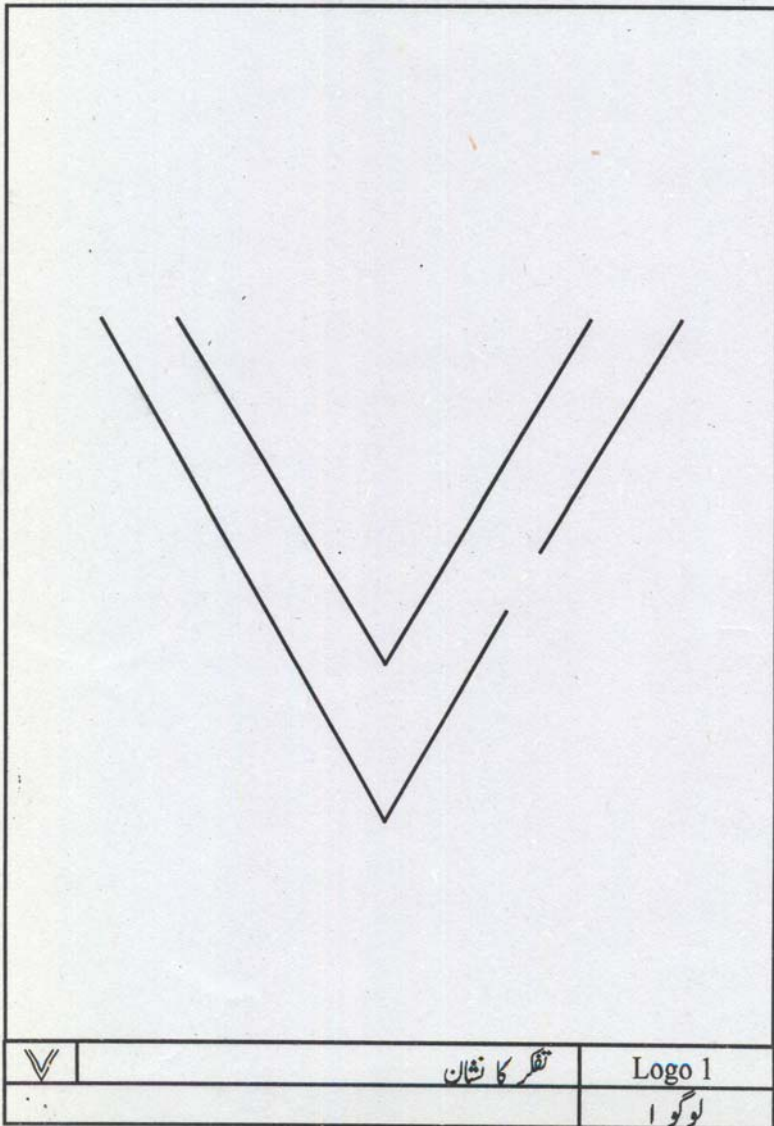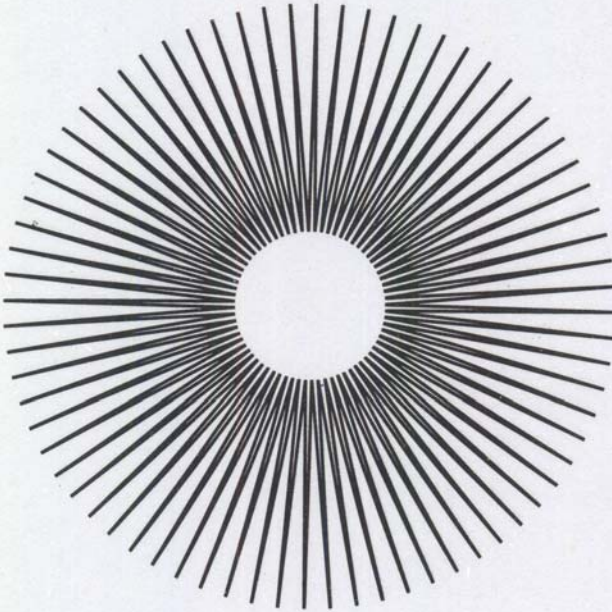
علم نافع کا نشان
Logo 2
لوگو ۲
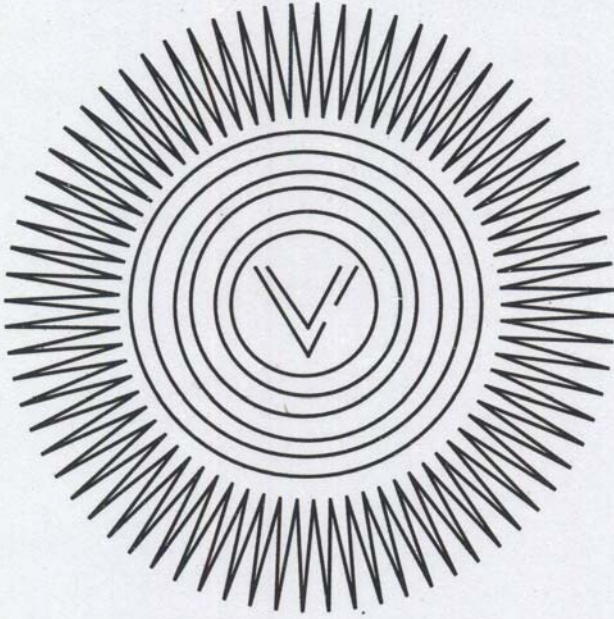
انعکاس کا نشان
Logo 3
لوگو ۳
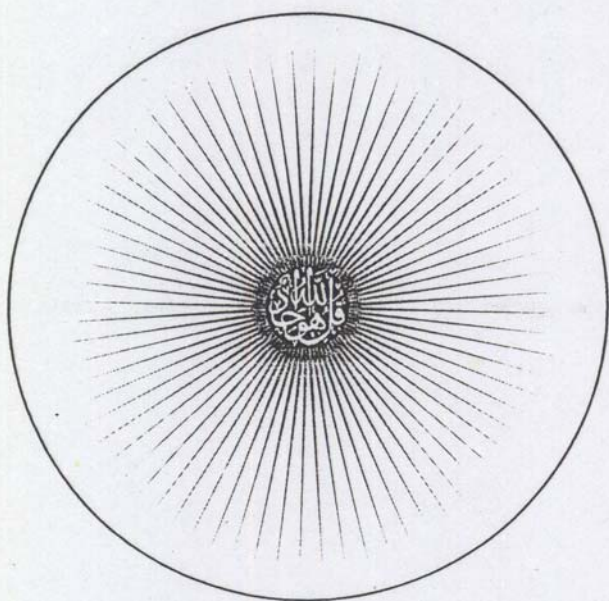
۵
توحید خالص کا نشان
Logo 4
لوگو ۴

تفکر

عقل کی حرکت کو تفکر، تدبر، تعقل کہتے ہیں تفکر سے مراد سوچنا
اور غور و فکر کرنا ہے۔

اصل اور نقل میں کیا فرق ہے؟ ایک آدمی متفکر ہے اور ایک آدمی مغز
متفکر ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ یہ آدمی پریشان ہے اور یہ آدمی متفکر ہے، یعنی
سوچ رہا ہے یا علمی افکار میں گم ہے، مفکّر ہے۔

جب انسان تفکر کرتا ہے تو عقل ہمیشہ معلومات سے مجہولات کی
طرف سفر کرتی ہے اور اس کا مقصد ان مجہولات کو منکشف کرنا ہوتا ہے، عقل
کا یہ عمل تفکر، تعقل اور تدبر کہلاتا ہے۔

جب انسان پریشان ہوتا ہے تو اس کی عقل معلومات اور مجہولات کے
درمیان گھومتی رہتی ہے اور اس صورت میں وہ انسان پریشان خیالی کا شکار رہتا
ہے۔ عام زبان میں ایسے آدمی کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ یہ متفکر ہے۔ مگر یہاں
اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ یہ پریشان خیالی کا شکار ہے۔

تفکر ہمیشہ عقل کی اس حرکت کو کہا جاتا ہے جو معلومات سے مجہولات
کی طرف ہو۔ جب عقل معلومات سے مجہولات کی طرف سفر کرتی ہے تو اس
کا مقصد ان مجہولات کو منکشف کرنا ہوتا ہے۔

علماۓ منطق نے تفکر کی تعریف اس طرح کی ہے :

حرکۃ العقل	(ک)	عقل کی حرکت
مِنَ المعلوم	(ز)	معلومات سے
الی المجھول	(لا)	مجہولات کی طرف
لکشف المجھول	(ش)	مجہولات کو منکشف کرنے کیلئے

۱۔ انسانی عقل کی حرکت کبھی بھی جہل سے علم کی طرف نہیں ہوتی ہے۔

لا ← ز

بلکہ علم سے جہل کی طرف ہوتی ہے۔

ز ← لا

۲۔ انسانی عقل کی یہ حرکت جہل میں گم ہونے کے لئے نہیں ہوتی ہے۔
بلکہ جہل کا کلیجہ چیر کر اسے علم میں بدلنے کے لئے ہوتی ہے۔
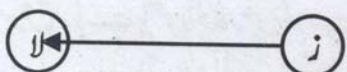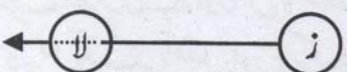
۳۔ انسانی عقل کی حرکت دو نقطوں یعنی ز اور لا کے درمیان نہیں ہوتی ہے۔
بلکہ تین نقطوں یعنی ز، لا اور ش کے درمیان ہوتی ہے۔

۴۔ پھر یہ حرکت ان تینوں نقطوں کے درمیان بغیر کسی وقفہ اور کنٹرول کے انجام نہیں پاتی۔
بلکہ

یہ حرکت مختلف مراحل پر کنٹرول بھی ہوتی رہتی ہے تاکہ اپنے صحیح راستہ سے منحرف نہ ہو۔

نیز،
اس حرکت کے دوران اسے مختلف نقاط و مقامات پر معین اور ضرورت کے مطابق اوقات بھر ٹھہر کر اپنا معین کام بھی انجام دینا ہوتا ہے۔

۵۔ عقل کی یہ حرکت جسے ہم تفکر کا نام دیتے ہیں، وہ جن حرکات کا مجموعہ ہے، ان سب کے لئے راستہ، قوانین، مقاصد، اہداف اور نتائج پہلے سے معین شدہ ہیں۔

۶۔ اس لئے،
عقل کی یہ حرکت یعنی تفکر ان تینوں نقطوں کے درمیان

ایک (شکل ۱، ۲)
دو (شکل ۳)
یا تین (شکل ۴)

حرکتوں کا مجموعہ نہیں ہے۔

۷۔ بلکہ،
تفکر، دراصل ان تین نقطوں کے درمیان عقل کی ایسی پانچ حرکتوں کا مجموعہ ہے جو کم از کم چار مقامات پر کنٹرول ہوتی ہیں، ان میں سے ہر حرکت کا راستہ، نقطۂ آغاز و انجام، مقاصد اور نتائج پہلے سے معین شدہ ہیں۔ (شکل ۵)

Fig. 1 | تفکر کا غلط تصور نمبر ا

شکل نمبر ا | ز ۔ لا ۔ ش کے درمیان عقل کی سیدھی حرکت
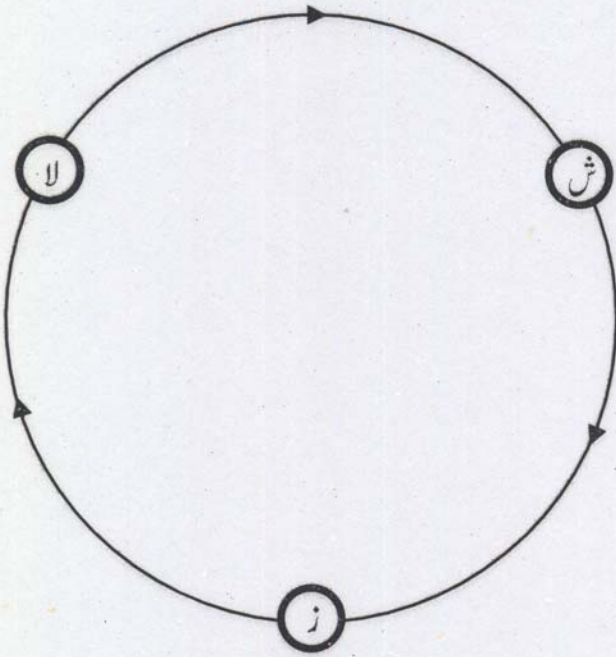
Fig. 2 — تفکر کا غلط تصور نمبر ۲

شکل نمبر ۲ — ز ۔ لا ۔ ش کے درمیان عقل کی مدور حرکت ۔

Fig. 3 — شکل نمبر ۳

تفکر کا غلط تصور نمبر ۳

ز ۔ لا ۔ ش کے درمیان عقل کی دو حرکتیں

لا
ش
ز
تفکر کا غلط تصور نمبر ۴
Fig. 4
ز ـ لا ـ ش کے درمیان عقل کی مثلث نما تین حرکتیں
شکل نمبر ۴
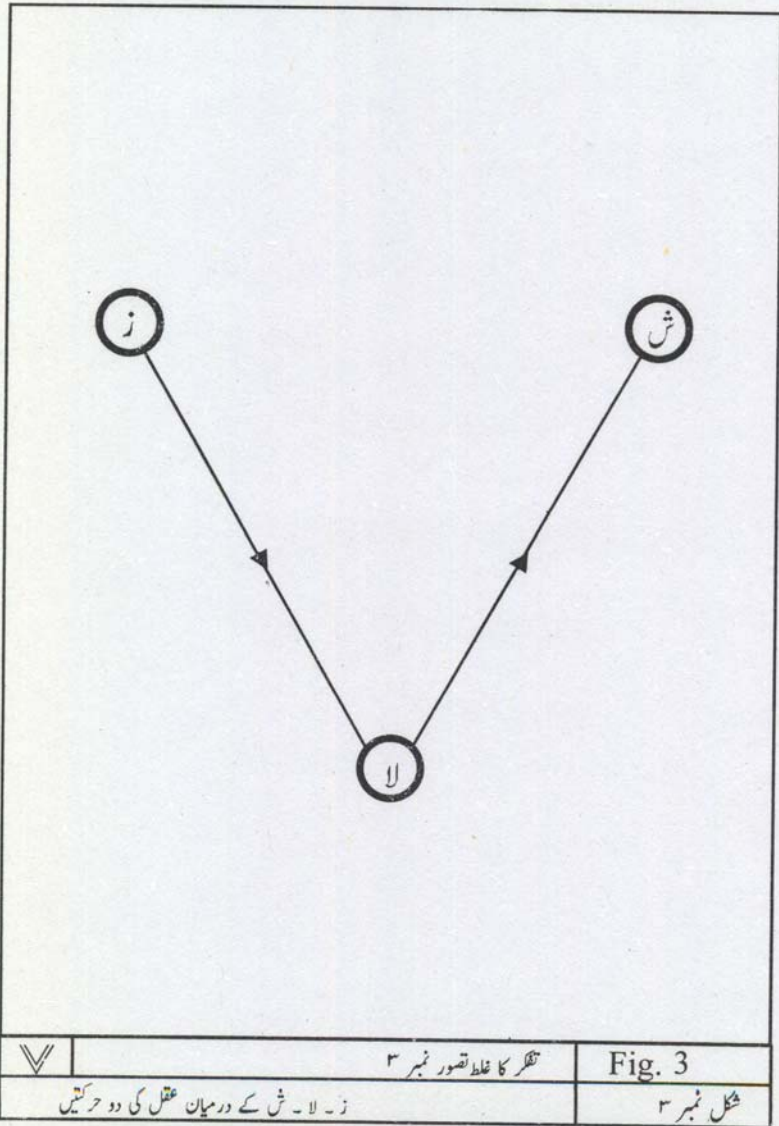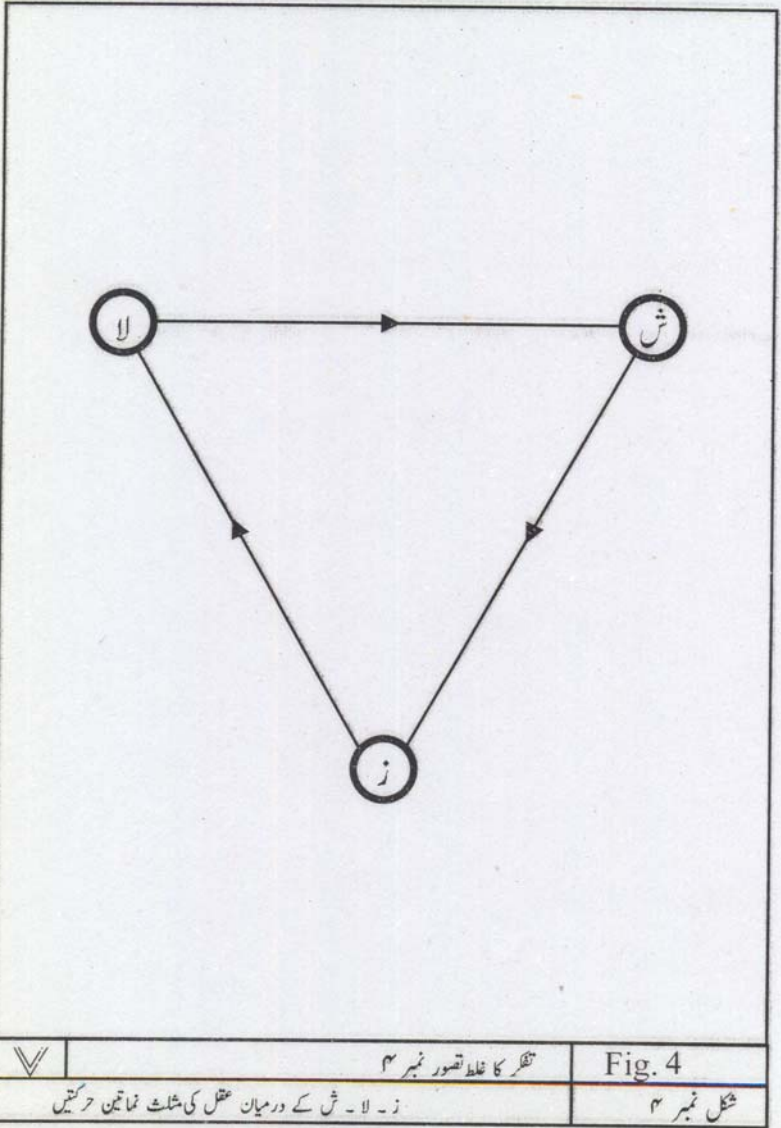
شکل نمبر ۵ کی توضیح

1 ز = مخزن ـــ انسانی معلومات کا خزانہ
2 لا = مجہولات ـــ نامعلوم اشیاء وافکار
3 ش = انکشافات ـ کرۂ تحقیق اور نئے معلومات
4. و = والو ـــ مخزن کا پہلا خودکار دروازہ یا والو جو مجہولات کی جانب باہر کی طرف کھلتا ہے۔
5 ل = والو ـــ مخزن کا دوسرا خودکار دروازہ یا والو جو عقل کے مجہولات سے مخزن کی طرف آنے کے لیے صرف اندر کی طرف کھلتا ہے۔
6 ح = والو ـــ مخزن کا تیسرا خودکار دروازہ یا والو جو عقل کے انکشافات / نئے معلومات کے حصول کے لئے کرۂ تحقیق کی جانب جانے کے لیے فقط باہر کی طرف کھلتا ہے۔
7 د = دروازہ ـــ مخزن کا اکلوتا خودکار دروازہ جو فقط باہر کی طرف اور صرف عقل کے نئے معلومات لے کر اندر آنے کے لئے کھولا جا سکتا ہے۔
8 ز ←و← لا کا معین ، محدود اور یکطرفہ راستہ
9 لا ←ل← ز کا معین ، محدود اور یکطرفہ راستہ
10 ز ←ح← ش کا معین ، محدود اور یکطرفہ راستہ
11 ش ← د کا معین ، محدود اور یکطرفہ راستہ
12 ز ←و← لا عقل کی پہلی حرکت جو مخزن یعنی معلومات سے مجہولات کی طرف ہوتی ہے۔
13 لا ←ل← ز عقل کی دوسری حرکت جو مجہولات سے مخزن کی طرف ہوتی ہے۔
14 ز ←ح← ش عقل کی تیسری حرکت جو مخزن سے مجہولات سے متعلق ابتدائی معلومات اور ان سے ملتی جلتی مخزن میں موجود معلومات کی جمع آوری کے بعد کرۂ تحقیق کی طرف ان مجہولات کو منکشف کرنے یعنی ان کے بارے میں قطعی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے ہوتی ہے۔
15 ش ← د عقل کی چوتھی حرکت جو نئے معلومات کو مخزن تک لانے کے لئے ہوتی ہے اس حرکت کا اختتام دروازہ پر ہو جاتا ہے جہاں آ کر عقل دستک دیتی ہے اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرتی ہے۔
16 د ← ز عقل کی پانچویں حرکت جو مخزن کا دروازہ کھلنے کی صورت میں نئے معلومات کو مخزن میں لانے کے لئے ہوتی ہے۔

Fig. 5 — تفکر کی صحیح تصویر

شکل نمبر ۵ — ز۔لا۔ش کے درمیان عقل کی پانچ حرکتیں

	تفکر کی صحیح تصویر	Fig. 5
	ز-لا-ش کے درمیان عقل کی پانچ حرکتیں	شکل نمبر ۵
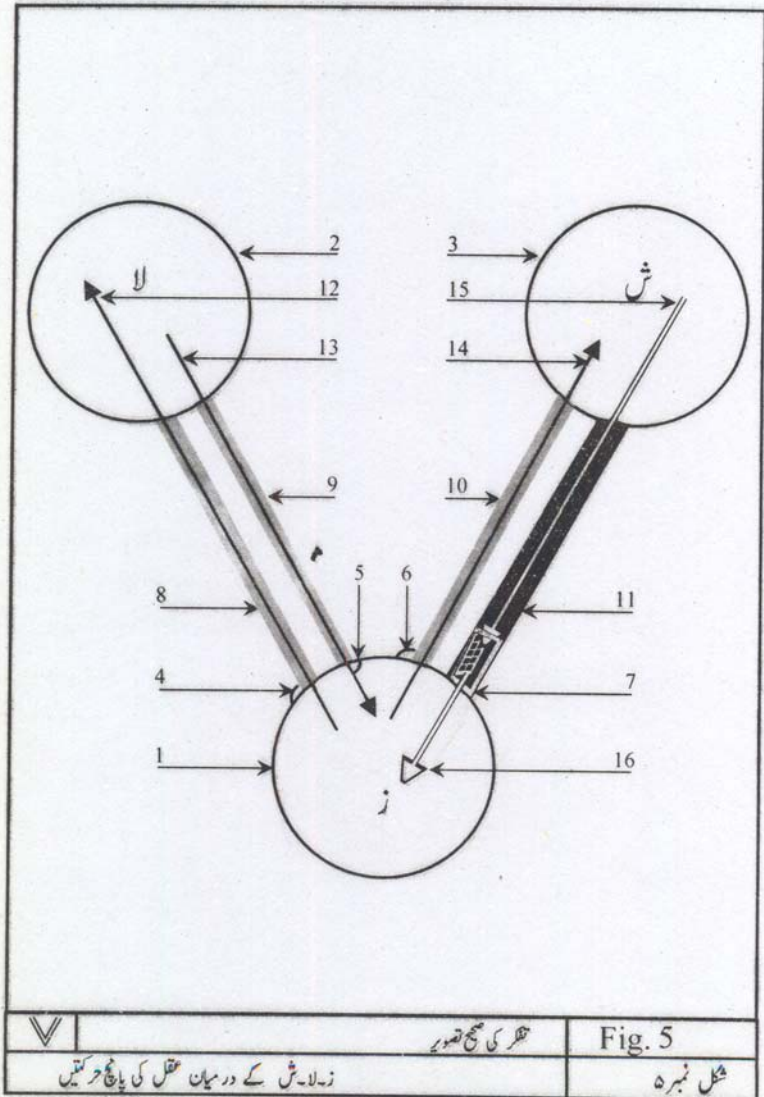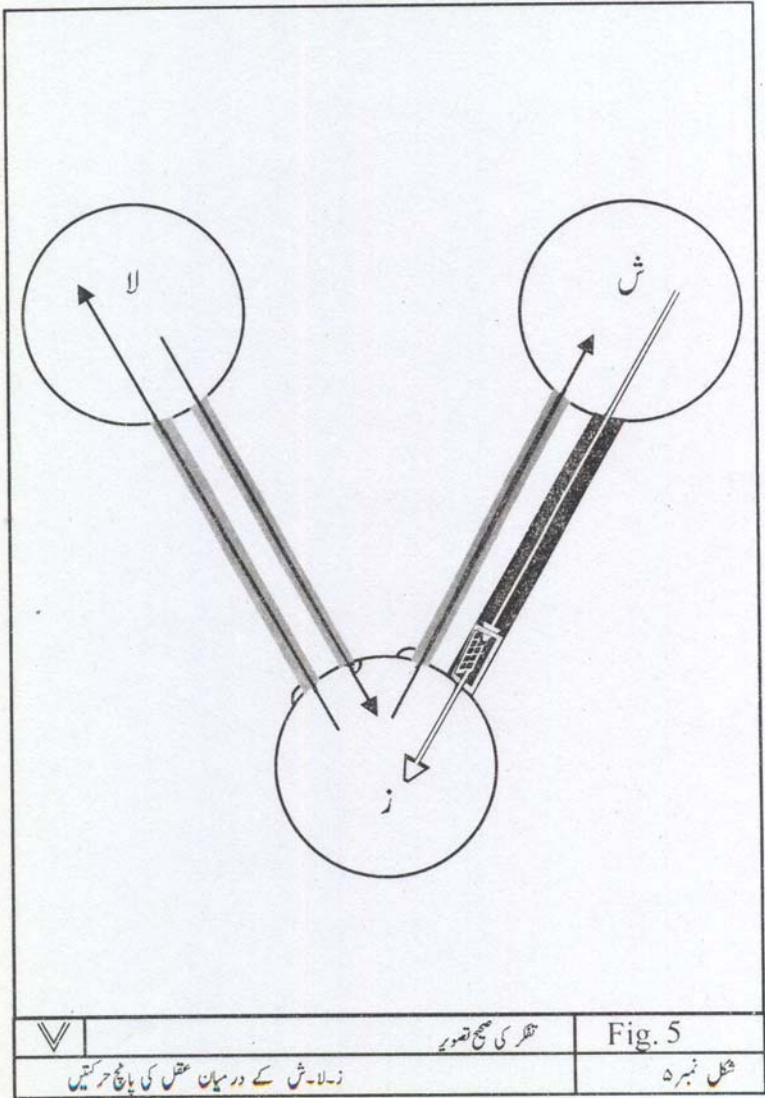
عقل کے
بچگانہ حرکات

فکر انسانی یا تفکر عقلی جن پنجگانہ حرکات کا مجموعہ ہے۔ اسے ہم نے شکل نمبر پانچ میں واضح کر دیا ہے۔ ان حرکتوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ پہلی حرکت:

ز ←—— لا یا، ز ——— لا

فکر انسانی کا آغاز عقل کی اس پہلی حرکت سے ہوتا ہے۔ یہ مخزن سے شروع ہو کر مجہولات تک رسائی پر ختم ہوتی ہے۔ اس حرکت میں عقل کو مخزن سے نکلنے کے لیے "و" واو نامی والو یا دروازہ سے گزرنا ہوتا ہے۔ یہ والو قدرتی طور پر اتنا حساس ہے کہ عقل جیسے ہی اس کے نزدیک جاتی ہے، وہ اس کے مقاصد اور اس کے ساتھ موجود لوازم کی شناخت اور پڑتال کر لیتا ہے، جب اسے یہ ادراک ہو جاتا ہے کہ عقل صرف ابتدائی معلومات حاصل کرنے والے لازمی ساز و سامان لے کر مجہولات کے بارے میں ابتدائی معلومات جمع کرنے کے مقصد سے مجہولات ہی کی طرف جانے کا ارادہ رکھتی ہے تو وہ بلا توقف خود بخود کھل جاتا ہے۔ ن تمام نکات و معاملات کو یہ والو بڑی تیزی سے سوال جواب کئے بغیر اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور مثبت صورت میں خود بخود

کھل جاتا ہے۔

چنانچہ اگر عقل یہ چاہے کہ مجہولات کے انکشاف کے لئے اس راستہ سے باہر نکلے تو یہ نہیں کھلتا۔

بہر حال اس کے کھلتے ہی، عقل کے سامنے مجہولات تک رسائی کے لئے ایک یکطرفہ اور سیدھا راستہ ہوتا ہے۔ جس میں نہ مڑنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ نہ واپس آنے کی۔ اس لیے اس والو سے نکل کر عقل کو بہر صورت مجہولات تک پہنچنا ہی پڑتا ہے۔

یہاں پہنچ کر عقل کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مجہول کے بارے میں وہ تمام ضروری معلومات جمع کرے جو اسے کشف کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

گویا؛ اس حرکت میں عقل کا:

الف : نقطۂ آغاز ـــــــ مخزن "ز"

ب : نکلنے کا راستہ ـــــــ واو "و"

ج : معین راستہ ـــــــ ز ـــوـــ لا

د : مقصد و ہدف ـــــــ مجہولات کے بارے میں ضروری معلومات کی فراہمی

ہ : نقطۂ اختتام ـــــــ مجہولات

ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری حرکت:

لا ـــــــ ز ، یا ، لا ـــــلـــــ ز

مجہولات کے بارے میں ضروری معلومات کی جمع آوری کے بعد عقل کو

مخزن کی طرف واپس آنا ہوتا ہے۔ اس واپسی کے لئے اسے ایک دوسرا، معین اور یکطرفہ راستہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یہ راستہ اسے سیدھا مخزن کے دوسرے خودکار دروازہ یعنی والو "ل" لام تک لے جاتا ہے۔

والو "ل" بھی خودکار ہے، اس میں بھی قدرتی طور پر یہ قوت ہے کہ وہ عقل کے قریب آنے سے پہلے یہ درک کر لیتا ہے کہ عقل خالی ہاتھ واپس آ رہی ہے؟ یا مجہولات کے بارے میں مطلوبہ معلومات لے کر آ رہی ہے؟ یا مجہولات کے علاوہ کسی اور سمت سے آ رہی ہے یا جدید انکشافات لے کر آ رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔

جیسے ہی یہ والو درک کرتا ہے کہ عقل مجہولات کے بارے میں ضروری معلومات لے کر آ رہی ہے۔ ویسے ہی یہ عقل کے پہنچتے ہی خود بخود کھل جاتا ہے۔ بصورت دیگر یہ کسی قیمت پر نہیں کھلتا۔

مجہولات کے بارے میں مطلوبہ معلومات کے ساتھ مخزن میں واپس آنے کے بعد عقل کا کام یہ ہوتا ہے کہ مخزن میں موجود معلومات اور ان نئے جمع شدہ معلومات کے درمیان جستجو کر کے اس مجہول یا ان مجہولات کو کشف کرنے کی کوشش کرے۔

اگر اس نئی شئے سے متعلق جمع شدہ معلومات سے ملتے جلتے معلومات مخزن میں اس کثرت سے مل جاتے ہیں کہ اس مجہول کے بارے میں فیصلہ کن رائے حاصل کرنا مشکل نہیں ہوتا تو انکشاف کے سلسلہ میں عقل کے انکشافی عمل کا پہلا مرحلہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

یہ فقط ایسی صورت میں ہوتا ہے جب یہ مجہول شئ یا اس سے بہت زیادہ ملتی جلتی چیز کے بارے میں مکمل معلومات خود سے یا کسی عقلی کاوش کے نتیجہ میں پہلے سے مخزن میں موجود ہوں۔

مثلاً

عقل مجہول تک پہنچ کر جو معلومات لے کر آئی ان کے بارے میں مخزن میں

پہنچ کر اس نے موجودہ معلومات کو تلاش کیا تو اسے معلوم ہوا یہ معلومات اسے بچپن میں ایک کتاب میں دکھائی گئی ایک تصویر کے ذریعہ حاصل ہوئے تھے اور اب یہی معلومات اسی قسم کی ایک زندہ چیز کو دیکھ کر حاصل ہوئے ہیں، لہٰذا یہ دونوں ایک ہی ہیں۔

گذشتہ معلومات کے نتیجہ میں اس کا نام شیر طے پایا تھا۔ وہ تصویر کا شیر تھا یہ سچ مچ کا شیر ہے۔

گویا، اس حرکت میں عقل کا:

الف : نقطۂ آغاز ــــــ مجہولات "لا"

ب : اندر آنے کا راستہ ــــــ لام "ل"

ج : معین راستہ ــــــ لا ← ل ← ز

د : مقصد و ہدف ــــــ مجہولات کے بارے میں ضروری معلومات اور مخزن میں موجود معلومات کے درمیان جستجو اور تطابق کی کوشش۔

ہ : نقطۂ اختتام ــــــ مخزن

ہوتا ہے۔

۳۔ تیسری حرکت:

ز ← ش یا ز ← ج ← ش

اگر پہلی دونوں حرکتوں کے بعد معین اور مطلوبہ جستجو کے نتیجہ میں یہ معلوم

ہوتا ہے کہ یہ مجہول یا مجہولات جن کے بارے میں اس سفر کے دوران عقل معلومات لے کر آئی ہے بالکل نئے ہیں۔ ان سے ملتی جلتی اشیاء یا افکار کے بارے میں اس سے پہلے وافر معلومات مخزن میں موجود نہیں تھے۔ تو عقل کو اپنی تیسری حرکت کے آغاز کی تیاری شروع کرنا ہوتی ہے۔

اس تیاری میں وہ مجہولات کے بارے میں حاصل شدہ معلومات کے ساتھ ساتھ مخزن میں موجود ان تمام معلومات کو بھی جمع کرتی ہے جو ان تازہ معلومات کے ساتھ مل کر اس مجہول شئی یا فکر کے بارے میں کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنے میں مددگار ہوں۔

اس تیاری کے بعد وہ تمام مطلوبہ معلومات لے کر کمرۂ انکشافات، دارالتحقیق یا لیبارٹری کی طرف جاتی ہے جس کو ہم نے "ش" کا نام دیا ہے۔

اس حرکت یا سفر کے لئے اسے مخزن کے تیسرے خودکار دروازہ یعنی والو "ج" سے گزرنا ہوتا ہے۔

والو "ج" بھی اگرچہ والو "د" کی طرح باہر ہی کی طرف کھلتا ہے، لیکن یہ فقط اس یک طرفہ شاہراہ پر کھلتا ہے جو "ش" کی طرف جاتی ہے۔ اس لیے اس میں قدرتی طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ عقل کے نزدیک پہنچنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح درک کر لیتا ہے کہ عقل واقعاً کمرۂ تحقیق کی طرف جانے کی مکمل تیاری کے ساتھ روانہ ہونا چاہتی ہے، یا اس کی تیاری نامکمل ہے؟ نیز یہ کہ اس نے مطلوبہ معلومات ساتھ لے لئے ہیں یا نہیں؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ دراصل "لا" کی طرف جانا چاہتی ہے مگر بھولے سے "ش" والے دروازہ کی طرف لپک رہی ہے۔

جیسے ہی والو "ج" یہ درک کر لیتا ہے کہ عقل کا ارادہ "ش" کی طرف جانے کا ہے اور وہ تمام تیاری مکمل کر چکی ہے نیز عام ضروریات اس کے ساتھ ہیں تو وہ تیزی سے اس کے لیے کھل جاتا ہے۔

یوں عقل بغیر کسی رکاوٹ کے سیدھی "ز" سے نکل کر "ش" تک پہنچ جاتی ہے۔

یہاں پہنچ کر عقل کو ان تمام نئی اور پرانی معلوم شدہ باتوں کے درمیان بار بار تعلقات جوڑ اور توڑ کر، غور و فکر اور تحقیق و جستجو کرنا پڑتی ہے، تاکہ اس نئی شئی کے بارے میں ایک واضح اور فیصلہ کن موقف اختیار کر سکے۔

گویا، اس سفر میں عقل کا:

الف : نقطۂ آغاز ـــــ مخزن "ز"

ب : باہر نکلنے کا راستہ ـــــ جسیم "ج"

ج : معین راستہ ـــــ ز ← ج ← ش

د : مقصد و ہدف ـــــ نئے مجہولات کے بارے میں فیصلہ کن رائے کا قیام یا نئے مجہولات کا انکشاف

ہ : نقطۂ اختتام ـــــ "ش" دار التحقیق

۴۔ چوتھی حرکت:

ش ⟸ د

جب "ش" میں جستجو اور تحقیق کا کام مکمل ہو جاتا ہے۔ تو اس کے نتیجہ میں عقل اس مجہول کو واضح اور فیصلہ کن انداز میں منکشف کر لیتی ہے۔ تب اسے اپنے ان تحقیقی نتائج کو لے کر ایک دوسری معین یکطرفہ شاہراہ سے مخزن کے منفرد غیر خودکار دروازہ "دال" "د" کی طرف آنا ہوتا ہے۔

ان نئے معلومات کو "د" پر لا کر عقل دستک دیتی ہے، اطلاع

دیتی ہے کہ وہ نئے معلومات لے کر آئی ہے، پھر دروازہ کھلنے کا انتظار کرتی ہے
گویا، اس سفر میں عقل کا :

الف : نقطۂ آغاز ـــــ دارالتحقیق "ش"

ب : معین راستہ ـــــ ش ⟸ د

ج : مقصد و ہدف ـــــ نئے انکشافات، تحقیقات اور معلومات کو دروازہ تک لاکر مخزن کے مالک کو مطلع کرنا اور اس سے ان کو اندر لانے کی اجازت طلب کرنا۔

۵۔ پانچویں حرکت :

د ⟸ ز

اب، اسے دروازہ کے باہر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اندرونی کارندے عقل سے ان نئے معلومات کے بارے میں ضروری نکات دریافت کرتے ہیں، اور انہیں پرکھنے کے بعد اگر ضروری خیال کرتے ہیں تو عقل کو اندر آنے کی اجازت دیتے ہیں، بصورت دیگر اسے وہیں روک دیتے ہیں۔

یہ دروازہ اسی وقت کھلتا ہے، جب عقل کو اندر سے نئے معلومات کے ساتھ داخل ہونے کی اجازت ملتی ہے۔

اگر عقل کو ان نئے معلومات کے ساتھ داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی تو وہ ان نئے معلومات کو وہیں چھوڑ دیتی ہے۔ داخل ہونے کی اجازت

ملنے کی صورت میں دروازہ کھلتے ہی فوراً اندر آجاتی ہے، اس کے اندر آتے ہی فوراً دروازہ بند ہوجاتا ہے۔

اندر آکر یہ ان معلومات کو موجودہ معلومات کے درمیان مناسب جگہ پر سجاتی ہے۔

یہاں پر عقل کی پہلی حرکت جو ان پنجگانہ حرکتوں کا مجموعہ ہے ختم ہوجاتی ہے۔
اس حرکت میں عقل کا:

الف : نقطۂ آغاز ـــــ دروازۂ مخزن بنام " د "

ب : اندر آنے کا راستہ ـــــ " د "

ج : معین راستہ ـــــ د ⟸ ز

د : مقصود و ہدف ـــــ نئے معلومات و انکشافات کا مخزن میں لاکر ان کو صحیح مقام پر رکھنا۔

کیا انسان بالکل جاہل پیدا ہوتا ہے؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان جاہل پیدا ہوتا تو پھر اس کی عقل کیسے علم کی طرف سفر کرتی ہے؟ یہ ناممکن ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب ایک انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے اندر معلومات کا ایک خزانہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ عقل ان معلومات کے خزانہ کے درمیان صدف کی سی حیثیت رکھتی ہے جیسے جیسے عقل پختہ ہوتی جاتی ہے وہ صدف موتی بنتا جاتا ہے۔ عقل کی مثال اس عالم یا اسکالر کی سی ہے جو ایک لائبریری کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ کچھ کتابیں پڑھ چکا ہے اور کچھ کتابیں پڑھنا باقی ہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو کتابیں اس نے پڑھ لی ہیں۔ اس کے سہارے وہ مزید دوسری کتابیں پڑھے۔ اس طرح وہ اسکالر پختہ ہوتا جاتا ہے۔

جب ایک بچہ دنیا میں آتا ہے تو سب سے پہلے روتا ہے۔ کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے۔ جب وہ کسی اجنبی جگہ پر جاتا ہے تو سوچتا ہے اور اسے پہچاننے نیز ماحول سے آشنا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بچہ اپنی اس کوشش کا اعلان رونے کے ذریعہ کرتا ہے۔ اگر اس بچہ کو خاموش کرانے کے لیے اس کو اسکی ماں کے سینے سے متصل کر دیا جائے تو وہ اطمینان حاصل کر لیتا ہے اور اگر اسی بچہ کو ماں سے دور کر کے اسے ٹیپ ریکارڈر سے ماں کے دل کی دھڑکن سنائی جائے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

کیونکہ جب یہ بچہ پیدا ہوا تھا تو یہ اگر چہ اس دنیا کے بارے میں جاہل تھا۔ لیکن جب اس نے اس اجنبی دنیا کا سامنا کیا تو اس کے ذہن کے ذخیرۂ معلومات میں یہ بات پہلے سے موجود تھی کہ یہ اس کی ماں ہی ہے۔ جس نے اسے اپنے جسم کا جزو بنا کر رکھا تھا۔ وہ ماں کے دل کی دھڑکن کو پہچانتا تھا یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ اس کے معلومات میں یہ چیزیں پہلے سے موجود تھیں، جب اس کی عقل نے اس دنیا کا جائزہ لیا، تو ان مجہولات میں سب سے پہلے وہ ماں کے لمس، اس کے جسم کی گرمی، اس کی طرف سے ملنے والی محبت، حفاظت اور جانثاری کو درک کر سکی، کیونکہ جو معلومات اس کے خزانہ معلومات میں پہلے سے موجود تھے ان میں سب سے واضح معلومات ماں ہی کے بارے میں تھے۔ پھر جب اس نے ان نئے معلومات کو پرانے معلومات سے ملا کر تحقیق و جستجو کے بعد یہ اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ ماں ہی ہے۔

اسی طرح ماں کی پہچان کی مدد سے باپ، دوسرے رشتہ دار، نیز غذا کی پہچان کی مدد سے دوسرے ضروریات زندگی وغیرہ کو پہچاننا شروع کر دیا۔

اسی طرح ہمیشہ معلومات، مجہولات تک رسائی اور ان کے انکشاف کا ذریعہ بنتے ہیں۔

جوں جوں انسان کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، توں توں عقل کی قوت نئے مجہولات کے انکشاف کے لیے تیزی سے حرکت کرنے لگتی ہے، پھر یہ کہ تمام انسانوں میں ابتدائی معلومات اور عقل برابر ہوتی ہے، صرف ان کے استعمال کے طریق کار اور انداز و رفتار میں فرق کے سبب ان کی عقل کی قوت عمل میں اضافہ یا کمی ہو جاتی ہے۔

ز، ش، لا کے امتیازات:

شکل ۵ پر غور کرنے نیز اصطلاحات و اشارات کے باب کے مطالعہ کے بعد ز، ش، لا کے بارے میں تصور کافی واضح ہو گیا ہوگا۔

یہاں پر ہم ان تینوں دائروں کے امتیازات بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں

ز — مخزن کے امتیازات:

ز ، غبارے کی مانند ہے؛ یعنی

۱۔ بڑھنے اور پھیلنے

۲۔ گھٹنے اور سکڑنے

کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر انسان اپنی عقل کی حرکتوں کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے نئے معلومات کو مخزن میں آنے سے نہ روکے تو معلومات کے اضافہ کے ساتھ ساتھ مخزن کا دائرہ بھی بڑھتا رہتا ہے۔

لیکن!

اگر انسان نئے معلومات کے حصول سے گھبرائے اور انہیں مخزن تک

آنے سے روکے تو یہ دائرہ سکڑنے لگتا ہے۔

ش ـــ کے امتیازات:

۱۔ سرعت رفتار

۲۔ گہرائی مطالب

جتنا انسان مجہولات کو کشف کرتا جائے گا، نئے معلومات حاصل کرنے کے سلسلہ میں اس کی رفتار اور گہرائی و گیرائی بڑھتی جائے گی۔
شروع میں ایک طالب علم کو ریاضی کا پہلا سوال حل کرنے میں دس منٹ لگتے ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ اسکی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور گہرائی بڑھتی جاتی ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ سوال کو فوراً حل کر لیتا ہے۔

لا ـــ کے امتیازات:

۱۔ بڑھتا ہی رہتا ہے۔

۲۔ کم نہیں ہوتا ہے اور سکڑتا نہیں ہے بلکہ پھیلتا ہے۔

"لا" ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے کم نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ عقل خواہ کتنی ہی تیز رفتاری سے مجہولات کو منکشف کرنا شروع کر دے پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلق ہونے والے نئے مخلوقات کی خلقت کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے "لا" کا دائرہ روز بروز بڑھتا ہی رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جوں جوں انسان کے معلومات بڑھتے جاتے ہیں۔ مجہولات کے سلسلہ میں اس کا ادراک بڑھتا جاتا ہے۔ جو افراد جتنے زیادہ انکشافات کرتے ہیں ان ہی کو اپنی جہالت اور نامعلوم اشیاء کی وسعت کا اسی قدر احساس و ادراک ہوتا ہے۔

تفکر کے مراحل کا نتیجہ :

عقل جب تفکر کے نتیجہ میں معلوم سے نامعلوم کی طرف حرکت کرتی ہے تو وہ ان مراحل سے گزر کر جو نتیجہ حاصل کرتی ہے وہ علم میں اضافہ نہیں بلکہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

معلُومات میں اضافہ (ض) :

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ جب عقل مجہولات کو منکشف کرتی ہے تو انسان کا علم بڑھتا ہے یا دوسری لفظوں میں یہ کہ تفکر کے نتیجہ میں انسان کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ تفکر کے نتیجہ میں عقل جن مجہولات کو منکشف کرتی ہے وہ انسانی علم میں اضافہ کے لیے خام مال، حوالہ جات، اطلاعات اور معلومات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گویا تفکر کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے انکشافات انسانی معلومات اور اطلاعات میں اضافہ کرتے ہیں نہ کہ اس کے علم میں۔ معلومات اور علم میں بہت فرق ہے۔ حرکاتِ تفکر کے نتیجہ میں عقل جو کچھ جمع کرتی ہے وہ پہلے سے موجود معلومات Information میں اضافہ کرتی ہے۔ علم میں اضافہ نہیں کرتی ہے۔ یہ معلومات عقل کے کارخانہ میں خام مال کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خام مال مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد تیّار مال کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ تیار مال علم ہے۔

عقل کی حرکت میں رکاوٹ :

عقل زندگی کی سب سے طاقت ور پاکیزہ اور قوی شکل ہے۔ جو ہمیشہ عالمِ حرکت میں رہتی ہے۔ اس لئے عقل کی حرکت کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

عقل "ز" میں محصور نہیں رہ سکتی ہے۔ جب عقل "ز" سے نکلتی ہے اور نئے معلومات کو جمع کر کے واپس "ز" میں آتی ہے تو اگر ہم نئے معلومات کیلئے دروازہ نہیں کھولتے ہیں تو جیسے جیسے عقل نکلتی جاتی ہے کمزور پڑتی جاتی ہے۔

عقل کا گھر یعنی معلومات کا خزانہ "ز" ایک غبارے کی مانند ہے دروازہ نہ کھلنے پر وہ غبارہ سکڑتا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں مخزن میں موجود معلومات کا ذخیرہ کمزور، منجمد اور پھر کم ہونے لگتا ہے۔

عقل کی حرکت میں رکاوٹ کا عمل وہاں سے شروع ہوتا ہے، جہاں سے عقل کی حرکت کی انجام دہی میں انسانی اختیار کا عمل شروع ہوتا ہے، اس اختیار کا پہلا مرحلہ نقطۂ "د" ہے۔

جیسا کہ شکل ۵ سے ظاہر ہے کہ عقل جب نئے اور جدید انکشافات لے کر مخزن میں واپس آنا چاہتی ہے تو اسے انسان سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ اگر انسان ان معلومات کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے اور یہ دروازہ کھولتا ہے تو یہ معلومات کو لے کر اندر آجاتی ہے۔ اگر انسان آمادہ نہیں ہوتا اور دروازہ نہیں کھولتا تو نہ صرف یہ کہ یہ معلومات کو اندر نہیں لا پاتی بلکہ خود بھی واپس نہیں آسکتی ہے، ایسی صورت میں عقل ان نئے معلومات یا ان کی فائلوں کو اسی دروازہ کے سامنے چھوڑ کر اپنا بوجھ اتار دیتی ہے اور خود سبک بال ہو کر کسی اور کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔

جب کسی کی طرف سے بار بار نئے معلومات کو قبول نہ کرنے کا عمل دہرایا جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں دروازہ "د" کے سامنے نئے معلومات بے ترتیب انداز میں کوڑے کے ڈھیر کی مانند جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

۱۔ ایک طرف تو دروازہ بہت کم کھلنے یا عرصہ تک نہ کھلنے کے سبب زنگ آلود ہو کر جم جاتا ہے اور اب اس کا کھولنا

آسان نہیں رہتا۔

۲۔ دروازہ کے سامنے نئے معلومات کا ڈھیر کوڑے کی شکل میں پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں باتیں مل کر حجاب اکبر بن جاتی ہیں، حدیث میں اسی علم کو حجابِ اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَلعِلمُ حِجَابُ الأَکبَرُ

وہ جدید معلومات جو مخزن کے دروازہ پر ڈھیر کی صورت میں پڑے رہیں وہ عقل پر پردہ بن جاتے ہیں۔

لیکن اس کے برخلاف اگر دروازہ بار بار کھلتا رہتا ہے تو بار بار کھلنے کی وجہ سے وہ اتنا رواں ہو جاتا ہے کہ تقریباً خود بخود کھلنے لگتا ہے۔ اسے کھولنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے اور جوں جوں معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہ غبارہ بڑھتا جاتا ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔

عقل کی حرکت میں رکاوٹ کی وجہ:

عقل جب مجہولات کو منکشف کرنے کیلئے حرکت کرتی ہے اس وقت اگر ہم نے اپنی عقل کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی اور اس کو استعمال نہیں کیا تو عقل کی حرکت اس مرحلہ پر آکر رکاوٹ کا شکار ہوتی ہے۔ اس وقت وہ رکتی نہیں ہے بلکہ روک دی جاتی ہے اس وقت کہتے ہیں کہ عقل کو استعمال نہیں کیا گیا اور اس کی مخالفت کی گئی ہے۔

اسی طرح سے جب کوئی شئ اپنے قانونی اور طبیعی حرکت سے رکتی ہے تو وہ خود بخود نہیں رکتی ہے بلکہ کوئی ایسی رکاوٹ لائی جاتی ہے۔ جو اس کو روکتی ہے۔ جس صاحبِ عقل کے اندر یہ عقل حرکت کر رہی تھی اس نے اپنی عقل کو استعمال

نہیں کیا ہے تو وہ آدھا عالم اور آدھا جاہل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ پورے کا پورا جاہل ہوتا ہے

عقل کی اس حرکت کو اگر انتہائی مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے روک دیا جائے تو وہ بانجھ ہو کر رہ جاتی ہے اور نتیجہ نہیں دیتی، اسکی خصوصیت یہ ہے کہ یا تو یہ مکمل نتیجہ دیتی ہے یا تباہ کر دیتی ہے۔ ناقص نتیجہ نہیں دیتی ہے۔

مثال: بلب کا سسٹم ایک ڈبیا میں بند ہے اگر ہم اس پر ہاتھ رکھیں گے تو وہ بلب جل جائے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم ہاتھ رکھیں اور وہ بلب نہ جلے۔ جتنی دیر ہمارا ہاتھ رہے گا اتنی دیر یہ بلب کام کرتا رہے گا۔ لیکن اگر ہم نے اس ڈبیا کو کھول کر اس کے اندر ایک کاغذ کا ٹکڑا ڈال دیا اور پھر اس کو بند کر کے ہاتھ رکھا۔ اب یہ بلب نہیں جلے گا، ہمارا ہاتھ کام کر رہا ہے، بلب کا سسٹم بھی کام کر رہا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بلب نہیں جل رہا ہے۔ یہ بلب اس لئے نہیں جل رہا ہے کہ ہم نے اس کے راستہ میں رکاوٹ ڈال دی ہے۔ اگر ہم اس رکاوٹ کو ہٹا دیں گے تو یہ بلب پھر سے کام کرنا شروع کر دے گا۔

مثال: آنکھ کے پپوٹے بہت حساس اور مضبوط ہوتے ہیں اور یہ پپوٹے آنکھ کے محافظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آنکھ کے اندر انتہائی باریک سا ذرہ داخل ہونا چاہے تو یہ پپوٹے فوراً حرکت کرتے ہیں اور آنکھ کی حفاظت کا انتظام کرتے ہیں

ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم خود اتنی پریکٹس کرتے ہیں کہ اگر تیر بھی ہماری آنکھ میں لگ جائے تو پلک نہیں جھپکے گی۔ یہاں پر ایسا نہیں ہے کہ ہماری آنکھ نہیں جھپک رہی ہے بلکہ نہیں جھپکا رہے ہیں۔ اس میں خود ہماری پریکٹس رکاوٹ بن جاتی ہے۔

یہ رکاوٹ کیا ہے؟ یا اس رکاوٹ کا سبب کیا ہے؟ یہ رکاوٹ یا اس رکاوٹ کا سبب عام طور سے نئے معلومات کے حصول میں پس و پیش ہوتا

ہے بقول علامہ اقبالؒ ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے، قوموں کی زندگی میں

جب کسی انسان میں یہ ڈر یا خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ کہیں نئے معلومات اس کے پُرانے اور موجودہ معلومات کو بگاڑ نہ دیں یا کمزور نہ کر دیں تو وہ نئے معلومات وصول کرنے سے پرہیز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی سبب اس کی عقل کمزور ہونا اور حرکت عقلی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

نتیجہ:

جب انسان سوچتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کے معلومات بڑھتے ہیں پھر وہ مختلف مراحل سے گزر کر جب بہت اچھے اور بہترین معلومات پر عمل کرتا ہے تو وہ عمل اس کی شخصیت کا جزو بن جاتا ہے اور پھر وہ چہرہ سے انعکاس کرتا ہے اور یہی انعکاس علم ہے اس بات کی وضاحت ہم عقلی حرکت کے مراحل پنجگانہ کے ذیل میں کریں گے۔

اگر انسان صرف ایک مرتبہ دروازہ کھول دے تو پھر ہمیشہ یہ کام اسکی عقل اس وقت خود انجام دیتی رہتی ہے۔ جب تک وہ خود سے اس دروازہ کو بند کرنے کی کوشش نہ کرے۔

انسان، دروازہ کھولنے کا ذمہ دار ہے:

عقل کے حرکات پنجگانہ میں فقط ایک مرحلہ کی انجام دہی انسان کے ذمہ ہوتی ہے۔ جب عقل نئے معلومات لاتی ہے تو انسان کو کشف کا دروازہ کھولنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کے اختیار میں ہے۔ عقل جو کہ خادم ہے وہ اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ لیکن اس کے لئے دروازہ کھولنا انسان کا کام ہے۔ اگر انسان اس

دروازہ کو باقاعدگی سے کھولتا رہے گا، تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ دروازہ خود بخود کھلنے لگے گا۔ اس کو کھولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی. یہ دروازہ آٹومیٹک ہو جائے گا اور جب یہ دروازہ آٹومیٹک ہو جائے گا۔ تو یہی جنت ہے۔

جب انسان اس دروازہ کو آٹومیٹک کرے گا تب امامِ زمانہؑ کا ظہور رہو گا، جب ۹۸٪ افراد کا یہ دروازہ آٹومیٹک والو میں تبدیل ہو جائے گا۔ تو اسی وقت امام زمانہؑ کا ظہور ہو گا۔ اگر امام زمانہؑ اس دروازہ کے آٹومیٹک ہونے سے پہلے آ گئے تو اگر وہ کوئی بات کہیں گے تو انسان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ یہ دروازہ سوئی کی نوک سے بھی زیادہ باریک ہے اور اسے صرف ایک اشارۂ قلبی کی ضرورت ہے۔

انسان کو صرف اور صرف اس دروازہ کو کھولنے کی کوشش کرنی چاہئیے باقی تمام کام آٹومیٹک ہو جائے گا۔

دروازہ کے خصوصیّات:

انسان کے ذمہ جس دروازہ کو کھولنے کی ذمہ داری ہے اس کے خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں :۔

۱. دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے۔
۲. دروازہ خود بخود نہیں کھلتا ہے۔
۳. اس دروازہ سے باہر نہیں جا سکتے ہیں۔
۴. خود سے دروازہ کھول کر اندر نہیں آیا جا سکتا ہے۔
۵. جو اندر ہے اگر وہ دروازہ کھولے تو عقل واپس اندر آ سکتی ہے۔
۶. دروازہ بار بار کھلنے کے سبب خودکار یا آٹومیٹک ہو جاتا ہے۔
۷. اگر دروازہ بند رکھا جائے تو جام ہو جاتا ہے اور اس کے سامنے گندگی کا ایسا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے جو اسے کبھی کھلنے نہیں دیتا ہے۔

ہر اچھی اور بُری بات کا سُننا:

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب عقل کوئی نئی بات لاتی ہے تو اس میں اگر کوئی ناپسندیدہ بات ہوتی ہے تو ہم نہیں سنتے ہیں اور دروازہ بند کر دیتے ہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ان گندی باتوں میں بہت کام کی بات بھی ہو۔ لہذا ہر اچھی بات اور بری بات کو سن لینا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی بھی بات خود اپنی ذات میں بری نہیں ہوتی ہے۔ صرف اس کو استعمال کرتے وقت یہ سوچنا پڑتا ہے کہ یہ بُری ہے یا نہیں؟ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ جب بھی عقل کوئی نئی بات لائے تو اس کو سننے کے لئے دروازہ کھولے۔ اس طرح یہ دروازہ خود بخود کھلے گا۔

قرآنِ حکیم میں خداوند عالم نے ان لوگوں کو بشارت دی ہے۔ جو نئے معلومات کو قبول کرتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد رب العزّت ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ٥ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ط

ترجمہ: "(اے رسول) تم میرے خاص بندوں کو خوشخبری دے دو۔ جو نئے معلومات کو لینے میں ہمیشہ دستک کے منتظر رہتے ہیں اور پھر اس میں سے اچھی بات پر عمل کرتے ہیں۔"

(سورۂ زمر آیت ۱۷، ۱۸)

قرآن حکیم میں خداوند عالم نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو نئے معلومات حاصل کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ط

ترجمہ: کہتے ہیں کہ ہم نے جس رنگ میں اپنے باپ دادا کو پایا وہی ہمارے لئے کافی ہے۔" (سورہ مائدہ آیت ؛ ۱۰۴)

قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ط

ترجمہ: "کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا۔"

(سورہ لقمان آیت: ۲۱)

بَلْ قَالُوٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ: "بلکہ یہ لوگ تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم ان کے قدم بقدم ٹھیک رستہ پر چل رہے ہیں۔"

(سورہ زخرف آیت ۲۲)

قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ط

ترجمہ: وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم یقیناً ان ہی کے قدم بقدم چلے جا رہے ہیں۔"

(سورہ زخرف آیت ۲۳)

جو شخص پرانے معلومات کے نتیجہ میں نئے معلومات کو قبول نہیں کرتا ہے۔ اس انسان کی عقلی موت ہو جاتی ہے۔ خدا سے اس کا رشتہ و تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ شخص شیطان کے لشکر میں شامل ہو جاتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ تفکر کے نتیجہ میں اپنے معلومات کو بڑھائے اور عقل کے ضروریات کو پورا کر کے اس کو مزید تقویت دے اور اپنی جہالت کو علم میں بدل دے نہ کہ اپنی عقل کی موت کا سبب بنے۔

عقل کے پنجگانہ اعمال

تفکر کے نتیجہ میں معلومات میں اضافہ کے بعد دراصل عقل کا وہ واقعی کام شروع ہوتا ہے جس کی وجہ سے عقل انسانی کو باقی عقول پر فضیلت حاصل ہے۔

یعنی، اب عقل انسانی ان معلومات کو ترتیب دیتی ہے، سلیقہ سے الگ الگ کر کے سجاتی اور سنوارتی ہے، پھر ان پر تحقیق کرتی، ان کے بارے میں جستجو کرتی اور انہیں چھانتی پھٹکتی ہے تاکہ ضروری، غیر ضروری، مفید، کم مفید یا بظاہر غیر مفید معلومات کو الگ کرے، پھر ان میں سے ضروری اور مفید ترین معلومات کو انسان کے سامنے اس طرح سجا بنا کر پیش کرتی ہے کہ اس میں ان معلومات کے مطابق عمل کرنے کا شوق، جذبہ اور پختہ ارادہ پیدا ہو جائے اور وہ اس پر عمل میں مصمم ہو جائے، پھر وہ اپنی نگرانی میں انسان سے اس پر عمل کرواتی ہے، جب یہ عمل بار بار دھرایا جاتا ہے تو انعکاس وجود میں آتا ہے۔

عقل کے ان تمام اعمال کو ہم عقل کے پنجگانہ اعمال کا نام دیتے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا عمل : ترتیب (ب) :

جب عقل کو انسان کسی تعصب کے بغیر ہر طرح کے اطلاعات و معلومات جمع کرنے کی اجازت دے دیتا ہے، یعنی وہ ""د"" نامی دروازہ کو کھول دیتا

ہے، تب دراصل عقل اپنے عمل کا آغاز ان معلومات و اطلاعات کو سلیقہ سے مرتب کرنے سے کرتی ہے۔

اس پہلے قدم پر عقل تمام معلومات کو ایک خالص عقلی ترتیب سے منظم کر کے، اس طرح سجاتی ہے کہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات اس طرح سمو جائیں کہ حسن و جمال بھی پیدا ہو جائے اور آئندہ کے کام بھی آسان ہو جائیں۔

دوسرا عمل : تحقیق (ق) :

ان اطلاعات و معلومات کو مرتب کرنے کے بعد عقل کا دوسرا کام یا عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں اچھی طرح چھان پھٹک اور تحقیقات کرے تاکہ ان میں سے ناقص کو جدا کر کے تفکر کے دائرہ میں کامل کرنے کے لیے اور کامل کو جدا کر کے تفکر کے دائرہ میں کامل تر کرنے کے لیے بھیجے۔

نیز انتخاب کے عمل کو ممکن اور آسان بنا دے یعنی اچھے، برے، صحیح، غلط، اہم، کم اہم وغیرہ کی تشخیص ممکن ہو جائے۔

تیسرا عمل : انتخاب (ن) :

تحقیق و جستجو کے بعد اب عقل اپنا تیسرا کام یعنی ان جمع شدہ معلومات کے درمیان انتخاب کا کام شروع کرتی ہے۔

گویا، اس مرحلہ میں عقل ان جمع شدہ معلومات میں سے انتخاب کرتی ہے وہ ضروری اور کارآمد مال الگ کر دیتی ہے اور غیر ضروری اور فضول مال الگ کر دیتی ہے۔ اس انتخاب کے وقت عقل کسی بھی معلومات کو پھینکتی نہیں ہے۔ بلکہ سیٹ کر دیتی ہے وہ فضول مال کو پھینکتی نہیں ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز اس وقت کارآمد نہ ہو لیکن کل کام آجائے گی اور کارآمد مال میں سے بھی عقل مفید مال الگ کر دیتی ہے اور بہت مفید الگ کر دیتی ہے۔

چوتھا عمل : تیاری (ر) :

انتخاب کے عمل کے بعد عقل کا چوتھا کام مفید ترین معلومات کو انسان کے سامنے اس طرح سجا بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر ان کے مطابق عمل کرنے کا قوی شوق اور جذبہ ابھر آئے۔

یعنی،

اب عقل مفید ترین معلومات پر اس طرح میناکاری اور صیقل یا پالش کرتی ہے کہ اس کا حسن وجمال، کشش اور چمک دمک انسان میں اس کے حصول کا ایسا جذبہ، شوق، لپک اور عشق پیدا کر دے کہ وہ اس کے مطابق عمل کے لیے مصمم ہو جائے، گویا اس میں عمل کا غیر متزلزل اور مضبوط ارادہ پیدا ہو جائے۔

پانچواں عمل : عمل (ع) :

انسان کو عمل پر آمادہ کرنے کے بعد، عقل کا پانچواں کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگرانی میں انسان اور اس کے اعضاءُ جوارح سے ان معلومات کے مطابق بار بار عمل کروائے۔ تاکہ یہ عمل خلوصِ نیت کے ساتھ بھی انجام پائے اور ان معلومات کے مطابق بھی ہو جن کو اتنی کاوشوں کے نتیجہ میں پختہ کر کے منتخب کیا گیا ہے۔

اس دوران عقل کو منتخب معلومات اور اعمال کے درمیان ظاہری اور باطنی لحاظ سے مطابقت کے علاوہ ان کی صحیح انجام دہی اور پیشکش دونوں پہلوؤں کی نگرانی کرنا ہوتی ہے۔ جس کی تصویر ہم نے شکل ۶ میں واضح کی ہے۔

نتیجہ ـــــ :
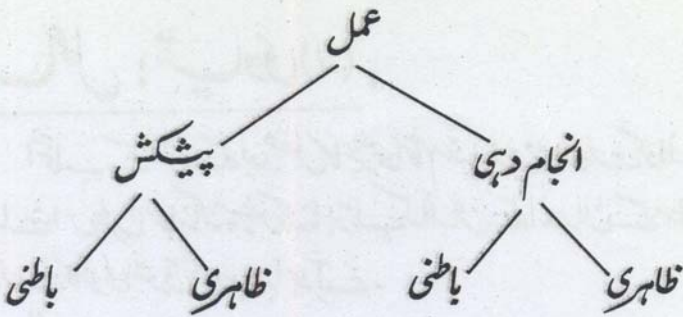
انعکاس :

عقل کے پنجگانہ حرکات نیز پنجگانہ اعمال کا آخری نتیجہ انعکاس ہوتا ہے۔ یہ حرکات واعمال اپنے اسی نتیجہ کے ساتھ مل کر علم نافع، معرفت یا نور بن جاتے ہیں۔ اس کی مختصر وضاحت ہم اگلے باب "انعکاس" کے ذیل میں کریں گے۔ نیز اسی باب کے آخر میں صفحہ ۱۵۹ پر انعکاس، معرفت، نور، ایمان یا یقین کی صحیح تصویر بھی پیش کریں گے۔

انعکاس

جب انسان عقل کی نگرانی میں عقل کے منتخب کردہ معلومات کے مطابق تمام شرائط و آداب کے ساتھ جن کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے، اعمال کو بار بار دھراتا ہے، تو یہ اعمال و افکار اس کی شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔ یہ اس کے خمیر کا حصہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اس کے ظاہری اور باطنی وجود اور شخصیت میں نکھار آجاتا، اور نورانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ نورانیت اس کے جسم و جان، قلب و روح، ظاہر و باطن میں ایک جذابیت پیدا کر کے اس سے انوارِ الٰہیہ کے پھوٹنے اور منعکس ہونے کا سبب بنتی ہے۔

یہی انعکاس دراصل علم ہے۔ یہی وہ تیار مال (Product) ہے جو عقل کی محنت شاقّہ کا نتیجہ ہے۔

احادیث میں اسی کو:

العلم نورٌ ـــــ علم نور ہے۔

کہا گیا ہے۔

اسی لئے کہا گیا ہے کہ علماء کے پاس بیٹھنا عبادت ہے۔ ان کے دروازہ کو دیکھنا عبادت ہے اور ان کے چہرہ کو دیکھنا عبادت ہے۔ کیونکہ جب ہم واقعی عالم کے چہرہ کو دیکھتے ہیں تو اس کا علم اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ اس کی شخصیت کے ساتھ اس کے گھر کے در و دیوار سے بھی منعکس ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح ائمہ علیہم السلام کی قبروں کی زیارت کرنا بھی عبادت ہے۔ کیونکہ یہ علم ان کے رگ وپے میں اتنا سرایت کر چکا ہے کہ اب وہ ان کی شخصیت کا حصہ بن کر انعکاس کرتا ہے۔ وہ انعکاس آج ان کی قبور مطہرہ سے بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس معرفت کے ساتھ ائمہ کی زیارت کو جاتا ہے تو ان کی شخصیت کا انعکاس اس میں ضرور اثر کرتا ہے۔

عقل کے پنجگانہ حرکات اور پنجگانہ اعمال کی تصویر:

علم نافع یعنی انسان، علم کس طرح حاصل کرتا ہے، یعنی وہ تفکر کے ذریعہ کس طرح اور کن مراحل کو طے کر کے انعکاس یعنی علم کی منزل تک پہنچتا ہے۔ اسے ہم نے شکل نمبر ٦ میں واضح کیا ہے۔ یہ شکل دراصل علم نافع کے ان تمام مراحل کو بیان کرتی ہے۔ جو تفکر " V " سے شروع ہوتے ہیں پھر اضافۂ معلومات، ترتیب، تحقیق، انتخاب، تیاری اور عمل سے گزر کر انعکاس پر ختم ہوتے ہیں۔ اگر آپ شکل نمبر ٦ کو غور سے ملاحظہ کریں تو یہ تمام مراحل آپ کو پوری وضاحت کے ساتھ اس تصویر میں جلوہ گر نظر آئیں گے۔
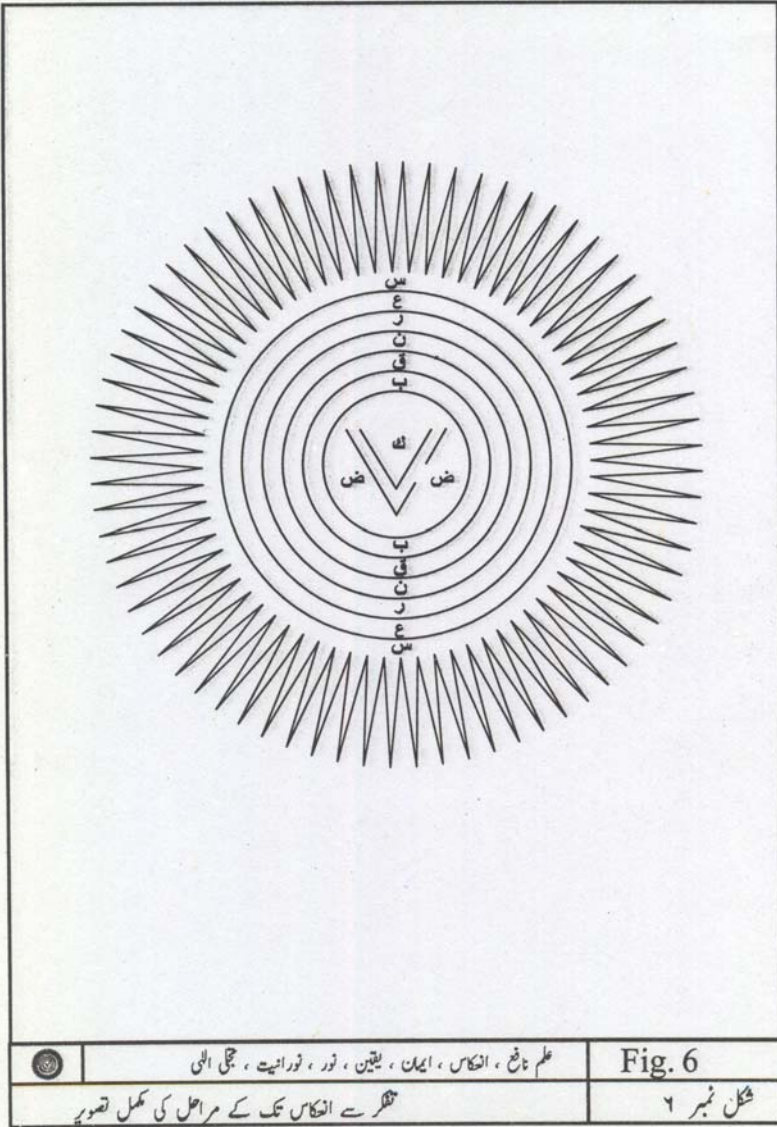
	علم نافع ، انعکاس ، ایمان ، یقین ، نور ، نورانیت ، تجلی الٰہی	Fig. 6
	تفکر سے انعکاس تک کے مراحل کی مکمل تصویر	شکل نمبر ۶

علم نافع —

بنیادی قانون

علم، علم نافع، علمِ مضر اور جہل کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ضروری ہے کہ ہم علم نافع کے بنیادی قانون کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں۔

علم نافع کا بنیادی قانون یہ ہے کہ :

اللہ تعالیٰ تو ہر لمحہ بغیر کسی غفلت، کوتاہی اور اونگھ کے انسان بلکہ اپنے تمام مخلوقات کی مسلسل مدد فرماتا ہی رہتا ہے، لیکن انسان کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ بھی اپنی عاجزی کم مائیگی اور کمزوری کا احساس کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت وعنایت وکرم کا ادراک کرتے ہوئے خود بھی ہر لمحہ بغیر کسی غفلت وکوتاہی کے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتا رہے۔

م : (ا ⇐ ⇒ آذ)

اس ← سے مراد ہے کہ اللہ انسان کی مدد کرتا ہے۔

اور

اس ⇒ سے مراد ہے کہ اللہ کی مدد میں تسلسل روانی اور تیز رفتاری وقوت پیدا کرنے کے لئے انسان خود بھی اللہ سے مدد حاصل کرے۔

اللہ تو تمام انسانوں کی مدد کرتا ہی رہتا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان خود اپنی تڑپ اور انکساری سے یہ محسوس اور درک کرے کہ اسے بھی اللہ کی مدد کی ضرورت ہے اور اللہ کی مدد آرہی ہے تو پھر یہ دونوں تیر ⟸ مل جاتے ہیں

انسان کو چاہیئے کہ وہ خدا سے مدد طلب کرے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے سب کچھ عطا کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی مزید مدد کرے تاکہ وہ تکامل حاصل کر سکے اور اپنے فریضہ کو صحیح طرح سے ادا کر سکے۔

اسی لئے خدا کہتا ہے کہ:

"مجھ سے مانگو میں تمہیں عطا کروں گا"

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اس دھوکہ میں رہتا ہے کہ وہ جو کام بھی کرتا ہے وہ اس کی محنت کا نتیجہ ہے، حالانکہ وہ کام جو اس نے انجام دیا ہوتا ہے اس میں خدا کی مدد بھی شامل ہوتی ہے، لیکن انسان اس کا احساس نہیں کرتا ہے۔

جب انسان کے اندر یہ احساس و شعور بیدار ہو جائے کہ ہر کام جو وہ کرتا ہے اس میں اللہ کی مدد شامل ہے اور اسی احساس کے ساتھ وہ اس کی طرف حرکت کرتا ہے کہ اسے ہر کام میں اللہ کی مدد کی ضرورت ہے اور اللہ کی مدد کے بغیر وہ کوئی کام کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کی نیت جتنی خالص اور اس کا ارادہ جتنا پختہ ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں اس کی قوتِ عقل کی لطافت، افکار کی پاکیزگی اور عمل کی ساخت و بافت و طریقہ میں تبدیلی و تکامل ہوگا۔

پھر جو کچھ انسان خدا سے طلب کرے گا تو خدا اس کو دس گنا بڑھا کر دے گا۔

انسان کے ارادہ و نیت میں خلوص اس وقت پیدا ہوگا جب وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کے حوالہ کر دے گا اور آیاتِ الٰہی میں اپنے آپ کو صرف کر کے یعنی خود کو مخلوقاتِ الٰہی پر نثار کر کے بے نیاز ہو جائے گا۔

جب یہ خلوص انسان کے نفس میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کرتا ہے اور اس پر یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ وہ زمین پر خلیفۃ اللہ ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو آیاتِ الٰہی میں کھو دیتا ہے اور ہر عمل آیاتِ الٰہی یعنی مخلوقاتِ خدا کی فلاح کے لئے کرتا ہے۔ یہ فنا فی اللہ ہوتا ہے۔

انسان کا ہر عمل اللہ کی خاطر:

جب انسان اس مرحلہ پر پہنچتا ہے کہ اس کا ہر عمل اللہ کے حکم کی اطاعت کے لئے ہے تو پھر وہ اللہ کی خاطر اللہ کی مخلوق سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ ان سے کوئی جدائی نہیں رکھتا ہے۔

اس مرحلہ پر "آ" اور "ذ" ایک ہو جاتے ہیں اور اس وقت انسان اپنے آپ کو اس کائنات کا ایک جزو سمجھ کر کائنات کے تکامل کے لئے کام کرتا ہے۔ مخلوقاتِ خدا کو فیض پہنچانے کے لئے کمال کی طرف بڑھتا ہے۔ اس وقت انسان ہادی/مہدی/خلیفۃ اللہ بن جاتا ہے۔

انسان کا ہر کام فنا فی اللہ ہو کر قربتہً الی اللہ ہونا چاہیئے۔ یہ دو اصطلاحیں ہیں جن کے صحیح معنی کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اگر انسان اس کے مطلب کو سمجھے بغیر کوئی کام کرے تو یہ شرک ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس نکتہ پر اچھی طرح غور کیا جائے کہ انسان کو اگر اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا خلیفہ، نائب اور جانشین بنا کر بھیجا اور اس کی خلقت کا مقصد اپنی اطاعت و عبادت قرار دیا تو اس کے معانی کیا ہیں؟

کائنات کی ہر شئی کی زندگی کے دو نمایاں پہلو ہیں۔

الف : خالق سے اس کا تعلق و رابطہ

ب : دوسرے مخلوقاتِ الٰہی سے اس کا تعلق و رابطہ

انسان کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو خداوند عالم نے انبیاء و رسل کے ذریعہ، اپنے کلام یعنی قرآن حکیم کے ذریعہ اور خود عقلِ انسانی کے ذریعہ اس طرح واضح کر دیا ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

جو لوگ اللہ کو اللہ یا اس جیسے کسی نام سے مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے انسان سے رابطہ کو کسی بھی وحی، نبی، رسول، اوتاد، اوتار یا اسی جیسے کسی وسیلہ سے مانتے ہیں یعنی کسی بھی دین کے قائل ہیں، یا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کو اس نام کے بجائے فطرت، حادثہ، مادۂ اولیٰ یا کسی بھی ایسے تصور سے مانتے ہیں جو ان کے نزدیک خواہ کتنا ہی مبہم ہو لیکن بہرحال اس کائنات کی خلقت کا سبب اوّل و آخر ضرور ہے، اور وہ اس نامعلوم قوت تخلیقیہ سے انسان کے رابطہ کو فقط عقل ہی کے ذریعہ تسلیم کرتے ہیں اور وحی و الہام و رسالت و نبوت پر اعتماد نہیں رکھتے وہ بھی خالق و مخلوق نیز انسان اور دوسرے مخلوقات یا موجوداتِ عالم کے درمیان رابطہ کے بارے میں ایک ہی تصور اور یقین رکھتے ہیں۔

یعنی

اہلِ دین ، فلاسفہ، منکر ادیان اور بظاہر منکرینِ خدا سب اس بات پر متفق ہیں کہ :

الف : انسان، اس کائنات میں خالقِ کائنات کا خلیفہ اور جانشین ہے یعنی خالقِ کائنات کی سب سے قدرت مند اور اس کے اوصاف کی سب سے نمایاں مخلوق ہے۔

سب اس بات کو اپنے اپنے پیرایہ میں، الگ الگ طریقہ اور سلیقہ سے کہتے ہیں، مگر سب کا مدعا ایک ہے۔

ب : انسان اور دوسرے موجودات کا باہمی رابطہ جانشین خدا ہونے کے سبب حاکم و محکوم کا ہے۔

یہاں تک تو سب متفق ہیں، اس کے بعد اختلاف کا آغاز ہوتا ہے اور وہ اختلاف یہ ہے کہ:

الف : انسان خدا کا نائب ہے یعنی:

۱۔ اس کا تابعدار ہو کر اس کا نائب ہے۔

۲۔ اس نیابت میں تابعداری اور سرکشی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

۳۔ نیابت ملنے کے بعد وہ سرکشی کا حق دار ہو چکا ہے۔

ب : مخلوقات پر حاکم ہونے کے سبب:

۱۔ انسان ان کے فلاح و بہبود و تکامل کا ذمہ دار ہے اور اس کا کام اپنے قویٰ و وسائل و اعمال سے دوسرے مخلوقات کو فیضیاب کرنا ہے۔

۲۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ تمام مخلوقات سے اپنی فلاح کے لیے کام لے۔ خواہ وہ ان کے لیے مفید ہو یا مضر۔

۳۔ انسان فقط اپنے تکامل و فلاح کی فکر کرے، دوسرے مخلوقات کو ان کے حال پر رہنے دے۔ یا حد اکثر یہ کہ جب خود مطلوبہ مقام و منافع حاصل کرے۔ تب دوسروں کی فکر کرے۔

ان مختلف قسم کے طرز ہای تفکر سے مختلف قسم کے فلسفہ ہای حیات جنم لیتے ہیں۔ ان تمام فلسفہ ہای حیات، یا فلسفہ ہای اخلاق کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ خود پرستی :

خود پرستی، خود غرضی، نفس پرستی، انانیت اور مَنیّت۔ یہ سب مترادف اور ہم معانی الفاظ ہیں جو ایک خاص قسم کے طرز تفکر کی نشاندھی کرتے ہیں۔ اس کے ذیل میں وہ تمام فلسفہ ہای حیات و اخلاق آجاتے ہیں جو انسان کی ذات، گروہ، خاندان، ملک، ملت یا کسی خاص گردہ کو مرکز بناتے ہیں ان میں آفاقیت و ہمہ گیری نہیں پائی جاتی۔

اس قسم کے طرزہای تفکر کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ:

ہر انسان کی اپنی ذات کو کائنات میں مرکزیت حاصل ہے۔ تمام موجودات تنازع للبقاء یعنی اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونے والے فیوضات پر ہر انسان کو سب سے پہلے اپنا، اپنے اہل و عیال، خاندان، ہم مشرب ہم مذہب، ملک یا کسی بھی ایسے محدود گروہ کا حق ثابت کر کے ان کے حصول کی تگ و دو میں رہنا چاہیئے، جو افراد یا گروہ اس کے ذاتی تکامل میں موثر ہوں۔

اسلام اور عقل کی نظر میں یہ خود پرستی وخود غرضی ہے جو آگے چل کر شرک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اگرچہ یہ تفکر اللہ کو محور قرار دے کر خالص وحدانیت کے روپ میں ہی جلوہ گر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔

ہم اسے شکل ۷ کے ذریعہ واضح کرتے ہیں۔ اگر آپ اس شکل کا بغور جائزہ لیں تو آپ کو اس شکل میں انسان کی خود غرضی واضح طور پر نظر آجائے گی۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے لئے مخلص ہے۔ لیکن دراصل وہ اللہ تعالیٰ کو

3
1
2
1- ا : اللہ تعالیٰ
2- ذ : انسان کی ذات
3- ← : انسان خود کو مرکز قرار دے کر ہر طرف سے فیوضاتِ الٰہی کے حصول کی کوشش میں رہتا ہے۔
خود پرستی
Fig. 7
انسان خود کو مرکز قرار دے کر ہر طرف سے فیوضات الٰہی کے حصول کی کوشش میں رہتا ہے
شکل نمبر ۷

	خود پرستی	Fig. 7
انسان خود کو مرکز قرار دے کر ہر طرف سے فیوضات الہی کے حصول کی کوشش میں رہتا ہے		شکل نمبر ۷

Fig. 8 — جھوٹی خدا خواہی

شکل نمبر ۸ — بظاہر انسان اللہ کو مرکز قرار دے کر خود اللہ کے گرد حرکت کرتا رہتا ہے

4
1
2
3
1- ل : اللہ تعالیٰ
2- ذ : انسان کی ذات
3- : انسان فقط اللہ سے اپنے تکامل کے لئے فیوضات حاصل کرتا ہے۔
4- : انسان ہر کام فقط اللہ کے تقرب کے حصول کے لئے کرتا ہے۔
Fig. 8
جھوٹی خدا خواہی
شکل نمبر ۸
بظاہر انسان اللہ کو مرکز قرار دے کر خود اللہ کے گرد حرکت کرتا رہتا ہے

اپنے فوائد کے لئے پوجتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ اس کا محتاج ہے۔ گویا اس کے بغیر خدا کی خدائی چل ہی نہیں سکتی۔

یوں، خدا کو مخلوق کا محتاج بنا کر پیش کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ خدا کے محتاج ہونے کا نظریہ باطل ہے اس لئے اس باطل نظریہ کو نفس انسانی میں مستحکم کرنے کے لئے وحدت الوجود اور لاموجود الا اللہ جیسی باتیں بن کر اسے بظاہر خالص توحیدی لباس بنا کر پیش کیا جانے لگا۔

حالانکہ، قرآن حکیم نے بے شمار مقامات پر اس طرز تفکر کو باطل قرار دیا اور اس کی سخت مذمت کی ہے۔

۲۔ جھوٹی خدا خواہی :

جھوٹی خدا خواہی، للّٰہیت کاذب یا وسواس نفسانی، یہ سب ہم معانی و مترادف الفاظ و اصطلاحات ایک دوسری قسم کے طرز تفکر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ طرز تفکر گذشتہ طرز تفکر کے بالکل برعکس ہے۔

اس طرز تفکر میں انسان اللہ تعالیٰ کو مرکز قرار دے کر خود اس کے گرد ایک مخصوص محور پر گھومتا ہے اور سمجھتا ہے کہ عبادت و اخلاص سے مراد یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے گرد گھومتا رہے۔ مخلوقاتِ الٰہی سے غافل ہو جائے، خود کو ہر قسم کے روابط و تعلقات سے توڑ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے گرد چکر لگاتا رہے، یہی خلقت کا مقصد ہے۔ سارے جہان سے ٹوٹ کر فقط اللہ کے ہو جانے کا مفہوم یہی ہے۔ اسی طرح انسان آلائشات سے پاک ہو کر اللہ تعالیٰ سے جا ملتا ہے۔

حالانکہ یہ بھی خود غرضی اور نفس پرستی ہی کا ایک روپ ہے۔ جس کی نہ کوئی منطق ہے اور نہ ہی انبیاء و ائمہ علیہم السلام کی سیرت میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔

اس لئے، اس طرزِ تفکر کے لوگ انبیاء و ائمہ علیہم السلام کی سیرت کو قابلِ عمل نہیں سمجھتے اور اپنے لیے مافوق شریعت اور اہلِ طریقت ہونے کے فلسفے اور نظریئے قائم کر لیتے ہیں۔

اس طرزِ تفکر کو ہم نے شکل ۸ کے ذریعہ صفحہ ۱۷۶ پر واضح کیا ہے۔

شکل ۸ پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان فقط اللہ تعالیٰ سے کسب فیض کرتا ہے اور ان کے نتائج کو فقط اسی کی طرف پلٹا دیتا ہے۔

یہ بھی خود غرضی و نفس پرستی ہی کی ایک قسم ہے۔ جس کو خالص للّٰہیت سمجھ کر نفس انسانی فریب کا شکار ہو جاتا ہے۔

۲۔ توحید خالص / فداکاری و خلوص

اللہ تعالیٰ نے اسلام اور قرآن حکیم کے ذریعہ ہمیں جس توحید خالص کی طرف دعوت دی ہے وہ دراصل ایمان، خلوص، فداکاری، ایثار، قربانی و تعاون کے ہم معانی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے انسان کو اس طرف ہدایت فرمائی ہے:

کہیں ارشاد ہوتا ہے:

خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا

انسان کو کمزور خلق کیا گیا ہے۔

(سورۂ نساء ۴، آیت ۲۸)

کہیں فرمایا:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

ایک دوسرے کی نیکی اور تقویٰ میں مدد کرو، دشمنی اور

برائیوں میں مدد نہ کرو۔

(سورہ مائدہ ۵، آیت ۲)

کہیں فرماتا ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا

اپنے ساتھیوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت قدم رہو۔

(سورہ طٰہٰ ۲۰، آیت ۱۳۲)

یا فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا

اے مومنو!

اپنے آپ کو نیز اپنے دوستوں اور گھر والوں کو جہنم یعنی اپنے اس بلند مقام اور مرتبہ سے پستی میں گرنے سے بچانے کی کوشش کرو۔ جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری خلقت کے وقت اپنا خلیفہ بنا کر تمہیں عطا کیا ہے۔

(سورہ تحریم ۶۶، آیت ۶)

کہیں پوری وضاحت کے ساتھ نیکی اور عبادت کی تعریف یوں کی جاتی ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ

فِی البَاسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِینَ البَأسِ اُولٰئِکَ الَّذِینَ صَدَقُوا وَاُولٰئِکَ ھُمُ المُتَّقُونَ۔

یہ بھی کوئی نیکی ہے کہ تم (لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے سب سے رشتے توڑ کر اپنی اجتماعی اور سماجی ذمہ داریوں سے فرار کر کے) مشرق یا مغرب کی طرف اپنے چہروں کو جھکا لو (اور لوگوں پر یہ ظاہر کرو کہ تم خدا کے مخلص و نیک و عبادت گزار بندے ہو) ہرگز نہیں ــــ!!

بلکہ نیکی تو دراصل یہ ہے کہ کوئی اللہ پر ایمان لے آئے، روز آخرت اور ملائکہ، آسمانی کتابوں اور انبیاء کی صداقت و واقعیت کو اچھی طرح سمجھ کر مان لے اور ان پر یقین کرے و ایمان لے آئے پھر اس کے بعد اللہ کی محبت میں اپنی کمائی کو رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں، اور گرفتار و غلام لوگوں کی فلاح و بہبود پر دل کھول کر خرچ کرے اور لٹائے۔ پھر (اس توفیق کے شکرانہ کے طور پر) نماز قائم کرے (اور اس طرح خرچ کرنے کے بعد بچ جانے والی کمائی سے) زکوٰۃ ادا کرے، معاشرہ اور معاشرہ کے افراد سے (ارادی یا غیر ارادی طور پر) کیے گئے وعدوں کو پورا کرے، مشکلوں اور نقصان کے موقعوں پر صبر و شکیبائی سے کام لے۔ اس قسم کے لوگ سچے مومن اور واقعی باتقویٰ ہیں۔ (سورہ بقرہ ۲، آیت ۱۷۷)

پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَیُؤثِرُونَ عَلٰی اَنفُسِھِم وَلَو کَانَ بِھِم خَصَاصَۃٌ

وہ لوگ ایسے ہیں کہ اپنی انتہائی ضرورت اور احتیاج
کے موقعہ پر وہ دوسروں کی کمتر ضرورت کی خاطر اپنی انتہائی
ضرورتوں کو قربان کرکے دوسروں کا سہارا بنتے ہیں۔

(سورہ حشر ۵۹ آیت ۹)

ان تمام آیات اور اس قسم کی دوسری آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان یا مخلوقات عالم اور اپنے درمیان بلاواسطہ کوئی رابطہ نہیں رکھا ہے۔ اس کی مشیت یہ ہے کہ ہر مخلوق دوسری مخلوق کے لیے ایثار و قربانی کے ذریعہ اس کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرے اور تمام مخلوقات ایک دوسرے کے تکامل میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔

اس طرز تفکر میں رابطہ فقط انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نہیں بلکہ انسان، دوسرے تمام الٰہی مخلوقات اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور رابطہ کا کام کرتا ہے۔

اللہ نے اپنی ہر مخلوق کو اس لیے خلق کیا ہے کہ وہ دوسرے مخلوقات کے کام آئے اور ان کے تکامل و ارتقا میں شریک و سہیم بن کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے۔

اس لیے اللہ کی جو بھی مخلوق جس قدر دوسرے مخلوقات کے تکامل میں حصہ دار بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اسی قدر خوش ہوتا اور اس کو اسی قدر عزت و عظمت عطا فرماتا ہے۔

شیطان کے بارگاہ الٰہی سے دھتکارے جانے کا سبب ہی یہ تھا کہ وہ انتہائی خود غرض تھا۔ وہ اپنے سامنے کسی کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کائنات کے تکامل میں انسان کی شمولیت اور اس کے حصہ کو بھی ناپسند کرتا تھا۔

شیطان یہ سمجھتا تھا کہ فقط وہی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں، انعامات

اور مراتب کا مستحق ہے کیونکہ وہ ہر وقت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و منزلت کی بات یہ ہے کہ اس کی ہر مخلوق دوسرے کے کام آئے اور دوسروں کو آگے بڑھانے اور کمال تک پہنچانے میں مسرت و خوشی محسوس کرے۔

گویا اس طرز تفکر میں انسان واقعتاً خلیفۃ اللہ کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ یہ طرز تفکر ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے نعمتوں، فیوض، برکات اور رحمتوں کو حاصل کر کے اپنے پاس روکنے کے بجائے مخلوقات الٰہی کے تکامل و پرورش کی خاطر ان حاصل کردہ نعمتوں کو کسی توقف اور تامل کے بغیر دوسرے مخلوقاتِ الٰہی تک پوری فیاضی کے ساتھ منتقل کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمہ وقت مخلوقاتِ الٰہی کو تکامل کی طرف لے جا رہا ہے۔ اب جو انسان اپنے آپ کو دوسروں کے تکامل کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا وسیلہ بنا لے گا۔ وہ اسی قدر خلافت الٰہی کا حامل اور منصب خلافتِ الٰہیہ کا اہل نیز فریضہ خلافت الٰہیہ کا ادا کرنے والا قرار پائے گا۔

اس طرز تفکر کی وضاحت ہم شکل نمبر ۹ کے ذریعہ کرتے ہیں۔

یہاں انسان کا کام ہے کہ اپنی ذات کو فدا کر کے مخلوقات الٰہی میں گم ہو جائے۔ ہر آن اللہ تعالیٰ کے فیوض و نعمات کو وصول کر کے مخلوقات الٰہی تک پوری فیاضی اور سرعت سے منتقل کر کے ان کے تکامل کے سامان فراہم کرنے میں مگن رہے اور اپنے کو مخلوقاتِ الٰہی پر اس طرح فدا اور قربان کر دے کہ گویا وہ اس سے زیادہ اہم اور ضروری ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان سے اسی عاجزی و انکساری و ایثار کا خواہاں ہے۔ اللہ انسان سے جس چیز کو چاہتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ خود کو تکامل کائنات کی خاطر فدا کر دے اسی فداکاری
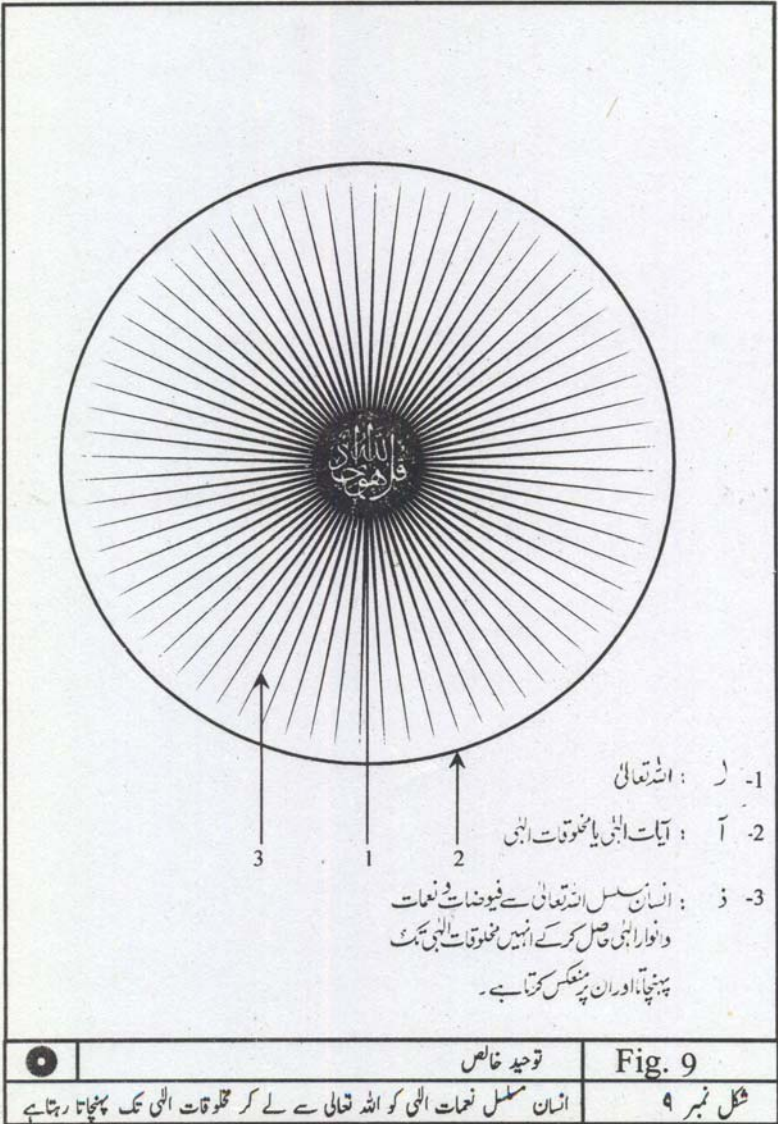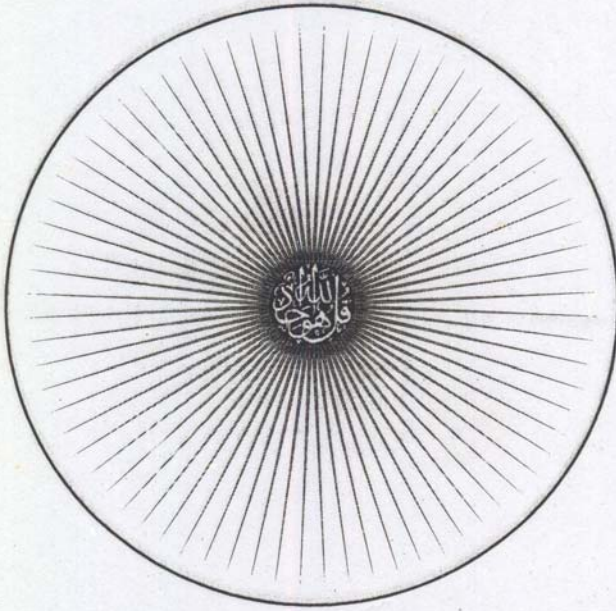
	توحید خالص	Fig. 9
انسان مسلسل نعمات الٰہی کو اللہ تعالیٰ سے لے کر مخلوقات الٰہی تک پہنچاتا رہتا ہے		شکل نمبر ۹

Fig. 9 — توحید خالص

شکل نمبر ۹ — انسان مسلسل نعمات الٰہی کو اللہ تعالیٰ سے لے کر مخلوقات الٰہی تک پہنچاتا رہتا ہے

کا نام تقرب الیٰ اللہ یا فنا فی اللہ ہونا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ تو کوئی ایسی ذات نہیں ہے جس میں کوئی چیز ضم، مدغم یا اضافہ ہو سکے۔ اس لیے فنا فی اللہ کے یہ معانی کہ انسان اپنے آپ کو اللہ میں گم یا ضم کر دے شرک کے مترادف ہیں۔

اسی طرح قربۃً الی اللہ کے یہ معانی کرنا کہ اللہ سے قریب ہو جائے، لایعنی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ

ہم انسان، بلکہ اپنی ہر مخلوق سے اسکی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

(سورہ ق ۵۰ آیت ۱۶)

اب اس سے زیادہ اور قرب کیا ہو سکتا ہے۔ تو قربۃً الی اللہ کے صحیح معانی یہی نکلتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی خاطر مخلوقاتِ الٰہی سے اتنا مانوس اور قریب ہو جائے کہ خود کو ان کے تکامل کی خاطر ان پر فدا کر دے۔ یہی دراصل مقصود خلقت انسان ہے، یہی مدعا ہے انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنانے کا اور یہی معانی و مفہوم ہے اطاعت و عبادتِ الٰہی کا۔

جس شخص کا تمام ہم و غم، فکر و عمل صرف اور صرف دوسروں کے تکامل پر مرکوز ہو اور اسے اپنی کوئی فکر ہی نہیں ہو، وہی دراصل صبغۃ اللہ یعنی صفاتِ الٰہی کا پرتو اور آئینہ دار اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہمیشہ سے اور باہمہ وجود فقط اور فقط تکاملِ مخلوقات ہی میں مگن ہے اور رہے گی۔ اس لیے وہ ایسے ہی افراد کو دوست رکھتی ہے اور ان ہی کو اپنا جانشین قرار دے سکتی ہے جو اس صفت کے واقعی آئینہ دار ہوں۔

اس نظریہ کے مطابق انسان کا کام ایک مزدور کا ہوتا ہے۔ یعنی انسان

مخلوقاتِ الٰہی کو تکامل تک پہنچانے میں خدا کی مدد کرتا ہے وہ مخلوقِ خدا کے تکامل کے لیے خدا سے نعمتیں حاصل کر کے خدا کے مخلوقات تک پہنچاتا ہے اس طرح سے وہ خدا اور مخلوقِ خدا کے درمیان ایک واسطہ بن جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

"خدا ہی نے ہم میں سے بعض کو بعض پر رزق (و دولت) میں ترجیح دی ہے۔ پھر جن لوگوں کو روزی زیادہ دی گئی ہے وہ لوگ اپنی روزی میں سے ان لوگوں کو جن پر ان کی دسترس ہے، (لونڈی، غلام وغیرہ) دینے والے بنیں۔ کیونکہ اس مال میں تو سب کے سب (مالک و غلام وغیرہ) برابر ہیں تو کیا یہ لوگ خدا کی نعمت کے منکر ہیں؟" (سورہ النحل ۱۶ آیت ۷۱)

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝

بے شک پرہیزگار لوگ (بہشت کے) باغوں اور چشموں میں (خوش و خرم) ہوں گے جو ان کا پروردگار انہیں عطا کرتا ہے۔ اسے یہ خوشی خوشی لیتے ہیں۔ یہ لوگ اس سے پہلے (دنیا میں) نیکوکار (بہت مشقت اٹھانے والے، ان تھک محنت کرنے والے، دوسروں کی مشکلوں کو حل کرنے والے) تھے۔ (اللہ تعالیٰ کی خاطر دوسروں کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے میں انتہائی مشغولیت کی وجہ سے) رات کو بہت ہی کم سوتے تھے اور پچھلے پہر مغفرت کی دعائیں کرتے تھے (صبح گاہ بندگان خدا کے

گناہوں کو بخشوانے کے لئے محنت و مشقت، ریاضت و عبادت، اللہ کی بارگاہ میں ان کی شفاعت اور لوگوں کے سامنے ان کی سفارش میں مشغول رہتے تھے) اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے (دونوں) کا ہوتا ہے اور یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں (قدرتِ خدا کی) بہت سی نشانیاں ہیں۔"

(سورہ ذاریات ۵۱ آیت ۱۵-۲۰)

خدا یہ نہیں چاہتا ہے کہ انسان اپنے ارتقاء کے لئے دوسروں کے وسائل اور قوت کو استعمال کرے اور اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد جو فالتو وقت یا مال و دولت بچ جائے وہ دوسروں کو دے دے۔

بلکہ خدا تو یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے واقعی مقام کو پہچانے اور اپنی انتہائی ضرورت کو دوسروں کی کمتر ضرورت پر فوقیت دے۔

قابلِ تعریف انسان خدا کا وہ عبد ہے، جو دوسروں کو سہارا دے اور دوسرے کے کاندھے پر چڑھ کر اپنا قد نہ بڑھائے۔ خدا کے نزدیک یہ شیطنت ہے۔

خدا کے نزدیک انسانیت یہ ہے کہ انسان دوسروں کو اپنے آپ سے بہتر سمجھے اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت سے زیادہ سمجھے اور اس کائنات کے تکامل کی فکر میں اپنے آپ کو اس کائنات کا ایک جزو سمجھے۔ تب یہ کائنات سنور جائے گی۔

خلاصہ

جب انسان اپنے آپ کو مخلوقِ خدا کا ایک جزو سمجھ لیتا ہے۔ اور اپنی واقعیت کو پہچان لیتا ہے تو پھر فنا فی اللہ یعنی فنا فی مخلوق اللہ کو بھی سمجھ لیتا ہے۔

ف = (ا ⟸⟹ آذ)

آذ = ف

جو اللہ ہر وقت انسان پر نعمتیں نازل کرتا ہے۔

اس قاعدۂ کلیہ میں ⟸ سے مراد ہے کہ اس حرکت کا انجام دینا انسان کا کام ہے۔

اس پورے کلیہ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان مخلوقاتِ الٰہی میں غور و فکر کرے اور خلوص نیت کے ساتھ اللہ سے مدد حاصل کرتا رہے اور اللہ کی مدد سے تکامل کے مراحل کی طرف گامزن ہو یعنی علمِ نافع حاصل کرے۔

خلوص نیت :

خلوص نیت کیا ہے ؟

خلوص نیت دراصل ارادہ کی طہارت، قدرت، ارادہ میں قربانی و ایثار کے جذبہ کے انتہائی رچاؤ، ارادہ میں اپنی ذات اور ذاتی فلاح کی نفی اور مخلوقات الٰہی کے تکامل کے نکتہ پر ارتکازِ کامل کا نام ہے۔ جو "من" یعنی۔ میں۔ سے خالی نیز فقط اور فقط اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع ہو۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ :

ہر کام میں اللہ کی مرضی شاملِ حال رہتی ہی ہے خواہ انسان چاہے یا نہ چاہے۔ لیکن جب انسان اللہ سے مدد طلب کرنا شروع کرتا ہے اور وہ اختیاری طور پر خدا سے مدد چاہتا ہے تو وہ خدا جو مسلسل نعمتیں بھیج رہا ہے، مدد کر رہا ہے، انسان سے مستقل طور پر مربوط ہے اور قوت دے رہا ہے وہ اس پر اپنے احسانات و تفضل اور نعمتوں کو بڑھا دیتا ہے۔

انسان جب کسی کام میں خدا کی مدد طلب کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں خدا سے اس کا ارتباط بڑھتا جاتا ہے اور اس ارتباط و وابستگی کے نتیجہ میں انسان کی حرکت اور قوت کم از کم دس گنا بڑھ جاتی ہے۔

جب انسان کسی بھی کام میں خدا سے مدد لیتا ہے تو اس میں انسان کی توجہ اور خلوص نیت جتنا بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی عقل کی حرکت لامتناہی حد تک تیز ہوتی جاتی ہے۔

عقل کی حرکت، جو معلومات کے حصول سے انعکاس تک ہے اس میں انسان کے معلومات جس قدر بڑھتے جاتے ہیں۔ اتنا ہی اس کی عقلی طاقت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ضابطہ:

اس کے لیے جو ضابطہ اور قانون الٰہی موجود ہے وہ یہ ہے:

(ا ⇐⇒ ذ) ⟵ (ذ ⟵ آ)

⇓

(خ + ت) (خلوص نیت)

انسان جتنی شدت سے اپنا کام انجام دے گا اتنی ہی اس کی قدرت و توانائی میں اضافہ ہوگا۔ جب انسان خدا سے مدد طلب کرتا ہے تو جو قدرت خدا نے انسان کو پہلے سے دی ہوتی ہے اسے کم از کم دس گنا بڑھا دیتا ہے۔

انسان کے جذبہ میں جتنا خلوص ہوگا اور اس کا ارادہ جتنا پختہ ہوگا۔ اتنی ہی اس کی توانائی اور قدرت بڑھتی جائے گی۔

اس کام کے لئے خلوصِ نیت اور توجہ شرط ہے۔ جتنی قدرت و گہرائی

خ + ت میں ہوگی ا + ذ یعنی اللہ اور بندہ یعنی ذات انسانی کا تعلق اسی قدر بڑھتا چلا جائے گا۔

آیات الٰہی اور مخلوقات الٰہی پر تفکر:

انسان کے اندر یہ قدرت اور توانائی اس وقت بڑھے گی جب وہ آیاتِ الٰہی اور مخلوقاتِ الٰہی میں تفکر کرے گا۔ وہ جتنا زیادہ آیاتِ الٰہی پر تفکر کرے گا اور ان کے حالات کو منکشف کرتا جائے گا اتنا ہی اس کا ارادہ مضبوط اور قدرت مند ہوتا جائے گا۔

انسان جتنا زیادہ آیاتِ الٰہی (آش) میں تفکر کرے گا اتنا ہی انسان تکامل کی طرف بڑھے گا اور اس کی قدرت میں اضافہ ہوگا اور "آش" کا نتیجہ "آذ" ہوگا۔

مثال: اگر انسان ایک پنسل پر غور وفکر کرے تو اس کے نتیجہ میں اس کے بارے میں اسے جتنی بھی باریکیاں معلوم ہوں گی تو اس کی لکھائی اتنی ہی مضبوط ہوتی جائے گی۔

(ا ⟸⟹ آذ)

انسان کو چاہیئے کہ اس بات پر غور کرے کہ اس کو عبث پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ انسان کو اللہ کی عبادت، اطاعت اور مقررات کی پابندی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

انسان کی خلقت کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوانینِ الٰہی کی پابندی کرے اور اس میں اپنی ذاتی رائے کو شامل نہ کرے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ہ

ترجمہ : ہم نے جنّوں اور انسانوں کو صرف اور صرف عبادت یعنی اللہ کی خاطر مخلوقاتِ الٰہی کی بے لوث خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔

(سورہ ذاریات ۵۱، آیت ۵۶)

عبد

تمام مقرراتِ الٰہی کی اطاعت

یعبدون

انسان کا کام انعکاس کرنا نہیں ہے بلکہ انسان کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ عمل کرتا رہے اور اپنے آپ کو اس بات کا اہل بنالے کہ وہ [illegible] وجودِ خدا کو درک کر سکے۔ انعکاس یا معرفت دینا تو خدا کا کام ہے۔ خدا اپنی قدرت سے انسان کی رہنمائی کرے گا اور اس پر اپنی تجلی کرے گا۔

علم پر عمل کرنے کے نتیجہ میں انسان کی ذات سے جو انعکاس ہوتا ہے۔ وہ یہی تجلی ہے جو خدا اس پر کرتا ہے یہ تجلی اور انعکاس ہی معرفت و الہام و علم ہے۔

علم نافع کے صفات :

اس علم کے کم از کم چار نمایاں صفات ہیں :

علم : تواضع (انکساری)

علم : ایثار (اپنی ضرورت کو دوسروں پر قربان کر دینا)

علم : محبّت (مخلوقِ الٰہی کو اپنے سے زیادہ چاہنا)

علم : خلوصِ نیت (نیت میں غرور نہ ہو، نیت سچی ہو)

واقعی انسان وہ ہے جس کو اپنی فکر نہ ہو اور وہ اپنے آپ کو مخلوقات

خدا کے لئے گم کر دے اور اس میں یہ چار صفتیں موجود ہوں۔

علم نافع کی خوبیاں:

اسی طرح اس علم نافع میں کم از کم یہ تین خوبیاں پائی جانا بھی ضروری ہیں:

۱۔ انعکاس اجباری ہے:

علم کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کا انعکاس اختیاری نہیں ہے۔ بلکہ اجباری ہے یہ انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ بار بار عمل کرے اور پھر اگر وہ چاہے تو شخصیت سے منعکس ہو اور اگر نہ چاہے تو منعکس نہ ہو۔ اس میں اختیار نہیں ہے۔

۲۔ رسائی کثیر الجہات ہے:

علم کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کا انعکاس ایک سمت سے نہیں بلکہ مختلف سمتوں سے ہوتا ہے۔ یعنی اس کی رسائی کثیر الجہات ہے۔

۳۔ اثر خود بخود ہوتا ہے:

علم کی تیسری خوبی یہ ہے کہ علم کا اثر خود بخود ہوتا ہے۔ یعنی جب انسان کسی چیز کو سمجھ لینے کے بعد اس پر بار بار عمل کرتا ہے اس کے نتیجہ میں اس کے ارد گرد کے ماحول پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کو وہ روک نہیں سکتا ہے۔

علم نافع کی تصویر:

علم نافع، معرفت کی اور نورانیت کی صحیح تصویر ہم نے شکل نمبر۱ میں بنائی ہے، جسے ہم "معرفت" نامی باب کے آخر میں صفحہ نمبر۲۰۱ پر پیش کر رہے ہیں۔

معرفت

عام طور سے خدا کو حاصل کرنے اور پہچاننے کو معرفت کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں کہیں پر بھی عرفان یا معرفت کا لفظ خدا کیلئے استعمال نہیں ہوا ہے۔ کہیں پر بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ خدا کو پہچانو۔ کیونکہ اللہ وہ ذاتِ واجب ہے کہ جس تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے اور انسان میں یہ اہلیّت نہیں ہے کہ وہ خدا کو پہچانے کیونکہ جو چیز انسان کی عقل میں آجائے۔ وہ اللہ نہیں ہے۔

بلکہ قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ آیاتِ الٰہی پر غور و فکر کرو۔ خدا فرماتا ہے کہ انسان کو اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے اور اس کو عقل اس لئے دی گئی ہے تاکہ وہ خدا کی اطاعت کرے اور منزلِ عبدیّت کو طے کرے۔

ائمہ علیہم السلام نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ معرفتِ خدا حاصل کرو۔ بلکہ دو نبیوں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمّد مصطفےٰؐ کو معراج اسی لئے ہوئی کہ وہ آیاتِ الٰہی یعنی خدا کی نشانیوں کو دیکھ لیں۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا و علیہ افضل الصلوٰۃ والسّلام کے بارے میں ارشاد ربّ العزّت ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِیْ إِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ٥

ترجمہ:

اور یوں ہم نے ابراہیم کو اس کائنات یعنی آسمانوں / بلندیوں
اور زمین کی بادشاہیوں یعنی ان پر حکمفرما قوانین کی گرفت اور
رعنائیوں کو اس طرح دکھایا کہ ان کا یقین پختہ ہو جائے۔

(سورہ انعام ۶/ آیت ۷۵)

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ أَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِیْ بٰرَكْنَا
حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا

ترجمہ:

پاک و پاکیزہ ہے وہ ذات جس نے اپنے ایک خاص بندے
کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جو اللہ تعالیٰ
کی طرف سے برکتوں ہی برکتوں میں گھرا ہوا ہے اس لیے
سفر کرایا کہ اسے اپنی نشانیاں اچھی طرح دکھا دیں۔

(سورۂ اسریٰ ۱۷/ آیت ۱)

قرآن میں کہیں پر بھی توحید کے اثبات کے لئے فلسفیانہ گفتگو نہیں
ہوئی ہے بلکہ توحید تو فلسفہ کے ذریعہ ان لوگوں کو سمجھائی جاتی ہے جو خدا پر
ایمان نہیں لاتے ہیں۔

انسان میں خدا کو درک کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ انسان صرف اتنا

درک کر سکتا ہے کہ اس کائنات کے تکامل کے عمل میں ایک منفرد اور عظیم الشان قدرت موجود ہے انسان یہ درک نہیں کر سکتا ہے کہ وہ قدرت کیا ہے؟ انسان میں فقط خدا کو ماننے کی اہلیّت ہے نہ کہ اس کو پہچاننے کی۔

اس لئے قرآن میں کئی مقامات پر خدا نے اس طرح فرمایا ہے۔ کہ آسمان کو دیکھو، شہد کی مکھی کو دیکھو، زمین کو دیکھو، چونٹی کو دیکھو، اونٹ کو دیکھو، پہاڑوں کو دیکھو اور ان پر تفکر و غور و فکر کرو تو تمہیں اللہ کے وجود کا یقین ہو جائے گا۔

قرآن میں ان چیزوں کے ذریعہ سے آیاتِ الٰہی پر تفکر کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

معرفت کا لفظ بنیادی طور پر یونانی زبان سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی پہچان کے ہیں۔

مسلمان مفکرین میں سب سے پہلے حضرت علیؑ نے عرفان یا معرفت کا لفظ استعمال کیا اور اس طرح سے استعمال کیا کہ اس کے نئے معنی سامنے آئے۔

حضرت علیؑ نے معرفت کے لفظ کو 'ایمان' کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ معرفت کا کمال خدا کی وحدانیت کا اقرار ہے۔

حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"دین کی بنیاد اللہ کی معرفت ہے۔ دین کی ابتدا ہی یہ ہے کہ آنکھ بند کر کے اللہ پر ایمان لے آؤ۔ اگر کسی نے اس کی طرف اشارہ کیا تو اس کو محدود کر دیا۔ اگر کسی نے اس کو گِنا تو اس کو معدود کر دیا۔ جو لوگ اللہ کو ایک مانتے ہیں وہ اپنی کمزوری کے سبب ایک مانتے ہیں معرفت کا کمال ایمان کا کمال ہے اور کمالِ تصدیق اس کی توحید ہے۔ کمالِ توحید

یہ ہے کہ اس کے لئے مخلص ہو جاؤ۔ توحید یہ نہیں ہے کہ اس کو ایک مان لو۔ توحید کے معنی ایک کے نہیں ہیں۔ بلکہ توحید کا کمال یہ ہے کہ پر اعتماد ہو جاؤ کہ تمہاری ہر حرکت اللہ کے لئے ہے، نہ کہ دوسروں کے لئے۔ اللہ کی ذات میں غور کرنا حرام ہے اور اس کے صفات کو اس کی ذات سے جدا جاننا بھی حرام ہے۔ کمالِ اخلاص یہ ہے کہ اس کی صفتوں سے انکار کردو کیونکہ صفت موصوف سے الگ ہوتا ہے۔ جس نے اللہ کی صفات کو بیان کیا اس نے شرک کیا اور اللہ کو سنگ لگا دیئے اور جس نے اس کو سنگ لگا دیئے اس نے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے کیونکہ اللہ کے صفات عین ذات ہیں ذات پر عارض نہیں ہیں۔ جو ایمان نہیں لاتا ہے وہ اشاروں سے کہتا ہے کہ میرا خدا آسمان پر ہے جب وہ یہ کہے گا تو وہ تعریف کر بیٹھے گا اور جس نے تعریف کی اس نے اس کو گنا اور جس نے اس کو کہا کہ وہ وہاں ہے تو اس نے اس کو دبوچ لیا اور باقی جگہوں سے خالی کر دیا۔ لیکن خدا تو ایسا موجود ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے وہ جدا ہے مگر ایسے نہیں جیسے جدا ہوا جاتا ہے اور وہ قریب ہے مگر ایسے نہیں جیسے قریب ہوا جاتا ہے۔ جس خدا کو عقل نے سمجھ لیا وہ تمہارا خالق نہیں ہے وہ مخلوق ہے اس کو خالق سمجھنا بت پرستی ہے خدا پرستی نہیں ہے۔"

اس لئے ہماری نظر میں انعکاس، علم، علم نافع، معرفت، تجلی، نور نورانیت، یقین اور ایمان سب ایک ہی معانی کو بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ ہماری نظر میں معرفت کی تصویر وہی ہے جو علم نافع یا انعکاس کی ہے۔

Fig. 10 — معرفت ، انعکاس ، علم نافع ، تجلی الٰہی کی تصویر
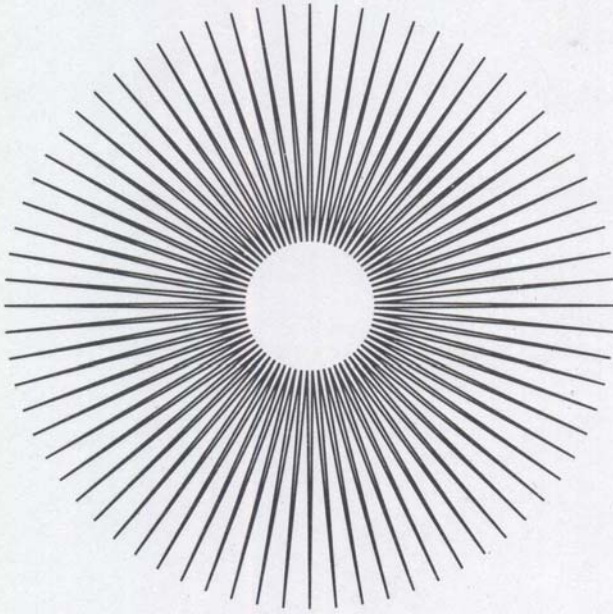
شکل نمبر ۱۰ — انوار الٰہیہ و فیوضات الٰہی کے انسان سے مخلوقات الٰہی کے لیے ان کا انعکاس

جہل اور لاعلمی

عام طور سے جہل، علم کی ضد کے طور پر علم کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن، اسلام نے جہل کو عقل اور لاعلمی کو علم کی ضد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری ہے

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ

اس مقام پر یوسفؑ نے دعا کی۔ اے میرے پروردگار! یہ عورتیں مجھے جس برائی کی طرف بلا رہی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مجھے قید زیادہ پسند ہے۔ تو میری مدد فرما اور ان کے شر کو مجھ سے دور کر دے کیونکہ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو ہو سکتا ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور جہالت یعنی بے عقلی اور حماقت کا کام کر کے احمقوں میں شامل ہو جاؤں۔

(سورۂ یوسف، ۱۲، آیت، ۳۳)

اسی طرح کافی کی پہلی جلد کی کتاب العقل والجہل میں ثقۃ الاسلام کلینی نے یہ روایت نقل کی ہے:

صَدِیْقُ کُلِّ امْرَیٍٔ عَقْلُہٗ

وَ

عَدُوُّہٗ جَھْلَہٗ

عقل ہرانسان کی دوست

اور

جہل یعنی بے عقلی اور حماقت اس کی دشمن ہوتی ہے۔

یوں تو قرآنِ مجید اور احادیث و روایات میں یہ کلمہ بہت سی جگہوں پر استعمال ہوا ہے، لیکن ان دو مقامات پر بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس آیت میں جہل سے مراد لاعلمی یا کم علمی نہیں بلکہ بے عقلی اور حماقت ہی ہے۔ اسی طرح مذکورہ حدیث میں بھی صاف طور پر جہل کو عقل کے مقابلہ میں بروئے کار لایا گیا ہے۔

پھر عربی زبان میں بھی جہل کا کلمہ بے عقلی اور حماقت کے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ زمانہ ما قبل اسلام کے شاعر کا مصرع ہے:

دَعَاكَ الْھَوٰی وَاسْتَجْھَلَتْكَ الْمَنَازِلُ

تجھے ہوا و ہوس میں گھری ہوئی، بیہودہ محبت نے آواز دی اور جب تو نے محبوب کے محلہ اور گلی کے مکانوں کو دیکھا تو اپنی عقل کھو بیٹھا۔

اس مصرع میں "اِسْتَجْھَلَتْكَ"، کا کلمہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ عرب محاورہ ہے:

"اِسْتَجْھَلَہٗ الشَّیُٔ"

یعنی کس چیز نے اس کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا۔

اسی طرح قرآنِ مجید نے نہ جاننے کو جہالت کے بجائے لاعلمی سے تعبیر کیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے:

وَاللّٰهُ اَخۡرَجَکُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِکُمۡ
لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَیۡـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ
وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَۃَ ۙ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۸﴾

ہم نے تمہیں ماؤں کے پیٹ سے اس طرح پیدا کیا کہ تم کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں جانتے تھے، لاعلمی کا شکار تھے، پھر اسی کے ساتھ ہم نے تمہیں قوتِ فہم (اَلسَّمۡعَ) قوت درک و بصیرت (الۡاَبۡصار) نیز قوت تفکر و تعقل (الۡاَفۡـِٕدَۃَ) گویا عقل کو بروئے کار لانے والی تمام تر قوتیں عطا کر دیں، تاکہ تم عقل کو استعمال کرو (تَشۡکُرُوۡنَ) کیونکہ ہر چیز کا واقعی شکر اس کا صحیح استعمال ہی ہوتا ہے۔

(سورۂ نحل ۱۶، آیت ۷۸)

بہرحال ہم یہ بتا چکے ہیں کہ علم اطاعتِ الٰہی کے دائرہ میں رہتے ہوئے عقل کے حرکات و اعمال کا وہ آخری مرحلہ ہے جس میں انسان کی ذات سے انوارِ الٰہی منعکس ہونے لگتے ہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم نے علم کو نور اور جہالت یعنی بے عقلی و حماقت کو ظلمت و تاریکی سے تعبیر کیا ہے۔

اس لیے انسان عقل کے حرکات و اعمال کو آخری مرحلہ پر پہنچنے سے پہلے جس مرحلہ پر بھی روک دے اسی مرحلہ پر یہ جہل ہو جاتا ہے اب یہ علم نہیں رہتا۔ یہ نہیں کہ وہ ناقص علم ہو جاتا ہے بلکہ وہ جہل یعنی بے عقلی اور حماقت ہی ہو جاتا ہے نہج البلاغۃ کی اس روایت میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا اشارہ اسی مطلب کی طرف ہے۔

لَا تَجۡعَلُوۡا عِلۡمَکُمۡ جَهۡلًا ۙ

وَ

یَقِیۡنَکُمۡ شَکًّا

فَاِذَا عَلِمْتُمْ فَاعْمَلُوْا

وَ

اِذَا تَیَقَّنْتُمْ فَاَقْدِمُوْا

اپنے علم کو جہالت اور اپنے یقین کو شک سے نہ بدلو!

چنانچہ

اگر تم اپنے علم کو علم کی آخری منزل تک پہنچانا چاہتے ہو

اور

اسے جہالت بنانے یا بننے سے روکنا چاہتے ہو تو

"اپنے علم کے مطابق عمل کرو"

اسی طرح،

اگر تم اپنے یقین کو شک میں نہیں بدلنا چاہتے ہو تو

"یقین کے مطابق فوراً قدم آگے بڑھاؤ"

کیونکہ،

جہل کا مطلب ہی عقل کا استعمال نہ کرنا ہے۔ اس لیے جس مرحلہ پر انسان عقل کے استعمال کو روک دے وہ جاہل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ، کسی بھی کام کو اگر ناقص چھوڑ دیا جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کام ہو گیا بلکہ یہی کہا جائیگا کہ کام انجام نہیں پایا۔

جیسے، اگر ہم کسی سے کہیں کہ ہمیں گلاس میں پانی لا دو۔ اور وہ گلاس میں پانی بھر کر ہمیں دینے کے بجائے باورچی خانہ میں رکھ کر چلا آئے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے ہمیں پانی لا کر دے دیا ہے۔

اگر انسان معلومات سے مجہولات کو منکشف کرنے کے بعد عقل کی حرکت کو روک دے تو یہ معلومات کا مجموعہ جہالت بن جاتا ہے۔ اسی طرح

اگر ان معلومات کو ترتیب دے کر رک جائے تو بھی جہل ہے۔ اگر انتخاب کرنے کے بعد رک جائے تو بھی جہل ہے اور اگر وہ عمل کے مرحلہ میں بھی آجائے لیکن اس کے باوجود اس کی ذات سے منعکس نہ ہو تب بھی یہ جہل ہے۔

گویا، عقل کی حرکت آخری مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے کسی بھی مرحلے پر رک جائے تو جہل ہے اور یہاں پر یہ کہیں گے کہ اس نے عقل کا صحیح اور مکمل استعمال نہیں کیا ہے۔

قاعدہ کلّیہ

اس تمام گفت گو کے نتیجہ میں جو قاعدۂ کلیہ ہمارے سامنے آتا ہے۔

وہ یہ ہے :

۱۔ انسان اللہ تعالیٰ کی مدد سے (ا ⟸⟹ ذ) ⟵

۲۔ اپنے خلوصِ نیت وارادہ اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر غور وفکر اور عمل صالح سے (خ + آ + ع) =

۳۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے اوپر اس کی تجلی کا اہل بنتا ہے۔ ہ ⟵

۴۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی تجلی کا اہل بن جاتا ہے تب اللہ تعالیٰ اس کی اہلیت کے مطابق اس پر تجلی کرتا ہے۔ یہ معرفت ہے۔ (ہ + ی) = م

م = (ا ⇐⇒ ذ) ⟵ (خ + آ) = ہ ⟵ (ہ + ی)

جب ہم معرفت کی اصطلاح کو حضرت علیؑ کے مفہوم میں سمجھتے ہیں تو اس سے مراد مخلوقاتِ الہٰی میں تفکر کرنا ہوتا ہے۔ یہاں پر 'ف' سے مراد 'م' ہوتا ہے۔

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان خدا سے دُعا کرے اور آیاتِ الہٰی میں غور و فکر کرے تو اس کے نتیجہ میں اس کی ذات سے انعکاس ہونے لگے اور اسے اللہ کی تجلی حاصل ہو جائے گی۔

اس لئے تمام ادیان خصوصاً اسلام میں دعا کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے کسی بھی لمحہ میں دعا سے غافل نہ ہو۔ کیونکہ دعا انسان کی اپنے خالق سے وابستگی، تعلق، رابطہ اور عشق کا اظہار بھی ہے نیز اس سے مسلسل مدد، ہدایت، علم، نور، معرفت اور تجلی کی عطا کا مطالبہ بھی۔

یہی وجہ ہے کہ دعا کو نہ صرف یہ کہ مومن کا اسلحہ کہا گیا ہے بلکہ قرآن حکیم احادیث نبویؐ اور تعلیمات اہل بیت علیہم السلام میں ہر موڑ پر مختلف انداز سے دعا کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

آخر میں ہماری بھی دعا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب اور ان کی آل کے صدقہ میں عقل کامل، توجہ سالم، تفکرِ صالح، نیت خالص، اعمال خیر کے توفیقات، توکل، قناعت، بے نیازی، علم نافع، یقین، نورانیت اور تجلی عطا فرما کر دین اسلام کی سر بلندی کے لئے معاد کی ایسی توفیق مرحمت فرمائے جو ہمارے لئے ذخیرۂ

آخرت اور سامان مغفرت و شفاعت ہو۔
آمین بحق محمد و آلہ الطاہرین

Afsheenfatima

آفشین فاطمہ آغا

Zainab

زینب امیر علی